مسلح تصادم اور داخلی خلفشار کے دوران جنسی تشدّد

اسلامی نقطۂ نظر

مجموعہ مقالات

(کانفرنس منعقدہ ۳۰-۳۱ اگست ۲۰۲۲ء)

تدوین

ڈاکٹر ضیاء اللہ رحمانی

حافظ احمد وقاص

ICRC

شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

انٹرنیشنل کمیٹی آف دی ریڈ کراس، پاکستان

مسلح تصادم اور داخلی خلفشار کے دوران جنسی تشدّد

اسلامی نقطۂ نظر

مجموعہ مقالات

(کانفرنس منعقدہ ۳۰- ۳۱ اگست ۲۰۲۲ء)

شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

و

انٹرنیشنل کمیٹی آف دی ریڈ کراس، پاکستان

جملہ حقوق طباعت محفوظ ہیں

مسلح تصادم اور داخلی خلفشار کے دوران جنسی تشدّد: اسلامی نقطۂ نظر

(مجموعہ مقالات کانفرنس منعقدہ ۳۰- ۳۱ اگست ۲۰۲۲ء)

تدوین:	ڈاکٹر ضیاء اللہ رحمانی، حافظ احمد وقاص
ٹرانسکرپشن:	عتیق احمد
پروف ریڈنگ:	حماد عزیز
کمپوزنگ:	محمد آصف قریشی
سنِ اشاعت:	۲۰۲۲ء

فہرست

- **تعارفی کلمات** ۵
  ڈاکٹر ضیاء اللہ رحمانی
- **استقبالیہ کلمات** ۱۵
  ڈاکٹر فرخندہ ضیاء
- **خطبۂ صدارت** ۱۷
  ڈاکٹر انیس احمد
- **مسلح تصادم اور داخلی خلفشار کے دوران جنسی تشدد: احتیاطی اقدامات** ۲۳
  ڈاکٹر فرخندہ ضیاء
- **جنسی تشدد: کلاسیکی اور جدید فقہی اجتہادات کے تناظر میں** ۴۱
  ڈاکٹر محمد طاہر منصوری
- **جنسی تشدد کے متاثرین کے علاج اور امداد کے حوالے سے معاشرے کی ذمہ داری: اسلامی سماجی نقطہ نظر** ۷۵
  ڈاکٹر عمار خان ناصر
- **مسلح تصادم کے موقع پر جنسی جرائم کا ارتکاب اور اسلامی تعلیمات** ۹۵
  ڈاکٹر سید عزیز الرحمٰن

- **تنازعات کے دوران میں جنسی تشدد: اسلامی نقطۂ نظر** ۱۱۱
  مفتی محمد زاہد
- **مسلح تنازعات کے دوران میں جنسی تشدد کی نفسیات اور اسلامی تعلیمات** ۱۱۹
  ڈاکٹر اشفاق احمد
- **حالت جنگ میں جنسی تشدد: اسلامی تعلیمات** ۱۳۷
  ڈاکٹر محسن نقوی
- **جنگی قیدیوں کو غلام بنانے سے متعلق اسلامی نقطۂ نظر: ایک تحقیقی جائزہ** ۱۵۵
  ڈاکٹر محمد عادل
- **جنسی تشدد اور پاکستانی قانون** ۱۸۹
  عمران شفیق ایڈووکیٹ
- **مسلح تصادم اور داخلی خلفشار کے دوران جنسی تشدد: اسلامی اور تاریخی تناظر** ۱۹۷
  سید معاذ شاہ

بسم الله الرحمن الرحيم

تعارفی کلمات

ڈاکٹر ضیاء اللہ رحمانی*

یہ دو روزہ کانفرنس شریعہ اکیڈمی اور انٹرنیشنل کمیٹی آف دی ریڈ کراس (آئی سی آر سی) کے تعاون سے ہو رہی ہے، جس کا موضوع مسلح تصادم اور داخلی خلفشار کے دوران ہونے والے جنسی تشدّد کا اسلامی نقطہ نظر سے جائزہ ہے۔ سب سے پہلے میں اپنے معزز مہمانوں کو شریعہ اکیڈمی اور آئی سی آر سی کے پلیٹ فارم سے خوش آمدید کہتا ہوں؛ اور ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اپنی مصروفیات میں سے کچھ وقت اس علمی سرگرمی کے لیے نکالا۔ الحمدللہ ہمارا مقصد خالص علمی ہی ہے؛ اس لیے کہ یہ ایک ایسا موضوع ہے جو بین الاقوامی سطح کی مختلف مجالس میں وقتاً فوقتاً زیر بحث رہتا ہے، اور ہم چاہتے تھے کہ اس موضوع پر جو علمی بحث چل رہی ہے اس میں ہمارا بھی حصہ ہو۔ ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ پاکستان سے کچھ معتبر لوگوں کو بلا کر ان کے علم اور تجربہ سے فائدہ اٹھا کر اس مسئلے کا جائزہ لیں اور اپنا وزن اس میں ڈالیں۔

یہ کانفرنس شریعہ اکیڈمی اور انٹرنیشنل کمیٹی آف دی ریڈ کراس کے تعاون و اشتراک سے ﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى﴾ [المائدۃ۵: ۲] اور ﴿تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ﴾ [آل عمران۳: ۶۴] کے باب سے ہو رہی ہے۔ جس چیز میں انسانیت کا فائدہ ہو اس میں ہمیں کسی کے ساتھ تعاون کرنے سے جھجکنا نہیں چاہیے، اگر واقعی وہ اس نیک مقصد کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔

آپ میں سے اکثر لوگ آئی سی آر سی سے واقف ہوں گے، میں مختصراً یہ ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ آئی سی آر سی کا قیام ایک خاص مقصد کے لیے عمل میں لایا گیا تھا۔ یہ ۱۸۶۳ء میں سوئٹزرلینڈ میں قائم ہوئی اور اس وقت اس کا مقصد محض یہ تھا کہ متاثرین جنگ کی غیر جانب دارانہ خدمت کی جائے اور جنگ کو کچھ قواعد وضوابط کے دائرے میں لایا جائے۔ یہ وہ وقت تھا جب یورپ میں جنگ

---

* ریجنل ایڈوائزر انٹرنیشنل کمیٹی آف دی ریڈ کراس برائے اسلامی قانون

وجدل کا ماحول تھا اور اس وجہ سے بہت زیادہ لوگ ہلاک، زخمی یا متاثر ہو رہے تھے، جبکہ ان کی خدمت کے لیے کوئی تنظیم نہیں تھی، جس طرح آج دنیا میں بہت زیادہ تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔ لہٰذا یہ تنظیم اس مقصد کے لیے وجود میں آئی کہ جنگ کے دوران کوئی زخمی ہو جائے، مارا جائے یا کسی بھی طرح متاثر ہو اور لڑائی کا حصہ نہ رہے تو اس کی خدمت کے لیے انسانیت کے ناتے کوئی تنظیم ہونی چاہیے جو غیر جانب دارانہ طریقے سے یہ خدمت سر انجام دے، اس کا دونوں فریقوں میں سے کسی کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو، اور وہ دونوں فریقوں کو اپنی غیر جانب داری باور کرا دے۔ لہٰذا اس کی ابتدا ۱۸۶۳ء میں ہوئی۔

جنگ ایک ناگزیر شر ہے جس سے بچنا یا رکنا ہر ذی شعور انسان کی خواہش تو ہو سکتی ہے لیکن عملاً یہ ناممکن ہے۔ بحیثیت مسلمان ہمارا بھی یہ عقیدہ ہے کہ یہ زندگی ایک ابتلا ہے، لیبلوکم أیکم أحسن عملا کے مصداق اس میں خیر و شر کے درمیان کشمکش ہمیشہ جاری رہے گی۔ لہٰذا جنگ ختم کرنے کے لیے کوشش تو ہو سکتی ہے، لیکن یہ جو تنظیم بنائی گئی تھی اس کا مقصد یہ تھا کہ جنگ کو ایک ناگزیر شر کے طور پر تسلیم کرتے ہوئے اس میں اوپر مذکور کوشش کے ساتھ ساتھ یہ کوشش بھی کی جائے کہ جنگ کو کچھ قواعد و ضوابط کے دائرے میں لایا جائے۔ جنگ کا مقصد دشمن کو شکست دینا ہوتا ہے، لیکن دشمن کو شکست دینے کے لیے جتنی قوت، طاقت اور ہتھیار استعمال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، انتقاماً دشمن کو ملیامیٹ کرنے کی خاطر اس سے کہیں بڑھ کر غیر متناسب قوت کا استعمال ہوتا ہے، چنانچہ اسے قواعد و ضوابط کے دائرے میں لانے کی کوشش کی جائے، جو کہ بذات خود ایک بہت مشکل کام ہے۔ تاہم ہر مشکل کام ایک ابتدائی کوشش سے شروع ہوتا ہے اور اس میں کسی حد تک کامیابی بھی ہوتی ہے۔

چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے ۱۸۶۴ء میں آئی سی آر سی کی دعوت پر سوئٹزرلینڈ کی حکومت نے ایک بین الاقوامی کانفرنس بلائی۔ اس میں پہلا جنیوا کنونشن منظور ہوا جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ جنگ کے دوران جو فوجی زخمی یا ہلاک ہو جائیں ان کا انسانی حق ہے کہ ان کی لاشوں

کو احترام کے ساتھ دفن کیا جائے اور جو زخمی ہوں اور لڑنے کے مزید قابل نہ رہیں ان کا علاج کیا جائے۔ اس پہلی جنیوا کانفرنس میں ۱۲ یورپی ممالک شریک ہوئے، تاہم بہت جلد خلافت عثمانیہ بھی اس سلسلے میں شامل ہو گئی۔ اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے ہر ملک میں ایک قومی انجمن بنانے کی تجویز سامنے آئی۔ چونکہ آئی سی آر سی ایک بین الاقوامی تنظیم ہے اور اس کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ہر ملک میں ہر کام کے لیے خود پہنچے۔ چنانچہ تمام رکن ممالک میں قومی انجمنیں بنائی گئیں جیسے ہمارے ہاں انجمن ہلال احمر ہے۔ یہ ساری انجمنیں مل کے کام کرتی ہیں۔

پہلا جنیوا کنونشن ۱۸۶۴ء میں منظور ہوا، لیکن اس کے بعد اس موضوع پر کئی کانفرنسیں ہوتی رہیں۔ ۱۸۹۹ء، ۱۹۰۷ء، ۱۹۳۱ء اور آخر میں ۱۹۴۹ء میں کوئی چھ مہینے تک بحث و مباحثہ ہوتا رہا جس میں کئی مسلمان ممالک کے سفیر بھی شامل تھے؛ پاکستان، لیبیا، سیریا اور دوسرے اسلامی ممالک کے سفیروں نے اس عمل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور انہوں نے نئے سرے سے ان جنیوا کنونشنز کو مرتب کر کے چار جنیوا کنونشنز کو منظور کیا۔ اس وقت یہ چاروں جنیوا کنونشنز نافذ العمل ہیں اور ان کو دنیا کے تمام ۱۹۲ ممالک تسلیم کر چکے ہیں۔ یہ بین الاقوامی معاہدات ہیں اور اس کے ساتھ تین ایڈیشنل پروٹوکول یعنی ملحقات ہیں جو ان معاہدات کا حصہ ہیں۔ ان جنیوا کنونشنز کے تحت آئی سی آر سی کو یہ اختیار حاصل ہے کہ جہاں جنگ کی صورت حال ہو وہاں یہ جا کر کام کر سکتی ہے۔

آئی سی آر سی کا کام کیا ہے جیسا کہ میں نے شروع میں ذکر کیا یہ میدان جنگ میں یا تشدد کی دیگر صورتوں میں متاثرین کی امداد کرتی ہے، جیسے شہری فساد، گینگ وار یا جیسا کہ جنوبی امریکہ میں بعض شہروں میں مافیاز آپس میں لڑتے رہتے ہیں یا حکومت کے خلاف لڑتے رہتے ہیں۔ یہ باقاعدہ جنگ تو نہیں ہوتی البتہ تشدد کی صورت حال ہوتی ہے۔ تشدد کی دیگر صورتوں (other situations of violence) سے یہاں یہ مراد لیا جاتا ہے۔

آئی سی آر سی کا ایک بڑا کام لاشوں کے انتظام و انصرام کے حوالے سے ہے، جس کو ہم ڈیڈ باڈی مینجمنٹ کہتے ہیں۔ یہ اس کی سپیشلائزیشن ہے۔ اس حوالے سے آئی سی آر سی دنیا بھر سے دوسرے ممالک میں ڈاکٹروں وغیرہ کی اور جن کو فرسٹ ریسپانڈرز کہتے ہیں ان کی تربیت کرتا ہے۔

ایک کام جنگ کے دوران بے گھر ہو جانے والے لوگوں کے لیے رہائش، پانی اور خوراک کا بندوبست کرنا ہے۔ یعنی وہ سارے کام جو باقی تنظیمیں کرتی ہیں آئی سی آر سی بھی کرتی ہے۔ لیکن ایک کام جو اس کے ساتھ مخصوص ہے وہ یہ کہ جو لوگ جنگی قیدی بن جاتے ہیں ان سے ملاقات کرنا، ان کا ریکارڈ رکھنا، تاکہ ان کے ساتھ قانون کے مطابق سلوک ہو، یہ کام آئی سی آر سی اس وقت کرتا ہے جب دو ممالک کے درمیان جنگ ہو اور اس کے نتیجے میں لوگ جنگی قیدی بنیں۔ لیکن اگر کسی ملک کے اندر ایک گروہ اور حکومت کے درمیان لڑائی ہو یا دو گروہوں کے درمیان لڑائی ہو تو آئی سی آر سی ان دونوں گروہوں کی اجازت کے ساتھ وہاں پر کام کرتی ہے؛ کیونکہ اس کے پاس کوئی قوت نہیں ہے، بلکہ یہ محض قبولیت کی بنیاد پر کام کرتی ہے۔ اس صورت میں دونوں فریقوں سے اجازت لے کر اگر وہ سمجھتے ہیں کہ آئی سی آر سی کی خدمات سے انہیں بھی فائدہ ہو گا یہ کام کیا جاتا ہے۔ جیسے افغانستان میں پچھلے بیس سال سے امریکہ اور طالبان کے درمیان جنگ ہو رہی تھی تو وہاں آئی سی آر سی طالبان کے علاقوں میں بھی جاتی تھی؛ کیونکہ انہوں نے بھی اس کو قبول کیا ہوا تھا اور امریکہ کے زیر کنٹرول علاقے میں بھی یہ کام کرتے تھے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آئی سی آر سی کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ ہے اور لوگوں، حکومتوں اور ریاستوں کو یہ پتا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ کام ممکن ہو جاتے ہیں جو کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ مثلاً میں آپ کو بتاؤں کہ افغانستان میں امریکی جیلوں میں جب طالبان قیدی تھے، بگرام وغیرہ میں، وہاں صرف آئی سی آر سی کے افراد جا کر ان کی رہائی کے علاوہ ہر کام کر سکتے تھے، کیونکہ ان کو رہا تو وہ نہیں کرا سکتے تھے البتہ ان کا ماحول وغیرہ دیکھتے تھے کہ ان کے ساتھ کس طرح کا سلوک ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ امریکہ کے جو چند قیدی طالبان کے پاس تھے، ان تک تو کسی کی بھی رسائی نہیں تھی اور صرف آئی سی آر

سی کو ان تک جانے کی اجازت تھی تو وہ ان کی خبر امریکیوں کو دیتی تھی۔ چونکہ دونوں فریقوں کو یہ معلوم تھا کہ اس سے انہیں فائدہ ہوتا ہے اس لیے انہوں نے اس کو اجازت دی تھی۔

یہ پروگرام جو ہم جنسی تشدّد کے موضوع پر کر رہے ہیں تو اس پر بھی آئی سی آر سی کی توجہ اس لیے ہے کہ اس کا تعلق جنگ کی صورت حال سے ہے، بلکہ دوران جنگ اس کا ارتکاب بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اس کی کئی صورتیں ہیں، مثلاً جب لوگ قابض قوت کے قیدی بن جاتے ہیں تو اس وقت وہ جس طرح چاہے ان کے ساتھ سلوک کر سکتی ہے۔ لہٰذا اس میں جنسی تشدد کا بہت زیادہ استعمال ہوتا ہے، اور یہ ایسا جرم ہے جو بہت کم رپورٹ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس کے ساتھ یہ سلوک ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ ہر ایک کو اس سے بچائے، وہ خود بھی شرم کے مارے اس کو رپورٹ نہیں کرتا اور اکثر یہ معاملہ زیر زمین چلتا رہتا ہے۔ یا مثال کے طور پر جب ایک قوت جو کسی ایک ملک پر قبضہ کر لیتی ہے یا جنگ کے دوران کسی کو عارضی طور پر گرفتار کر لیتی ہے اس کی فوج دوسرے علاقوں میں داخل ہوتی ہے تو جنگی کارروائیوں کے دوران اس طرح کے معاملات بہت زیادہ ہوتے ہیں، تو دوسرے معاملات کے علاوہ آئی سی آر سی کی اس پر توجہ ہے کہ اس طرح جو لوگ بے بس ہوتے ہیں مثلاً جو فوجی قید میں آ چکے ہیں یا عام شہری ہے جو کسی کے قبضے میں آ گیا تو اس کے ساتھ غیر قانونی سلوک نہ ہو، تشدد نہ ہو۔ چنانچہ جو جنسی تشدد ہے یہ بھی بین الاقوامی قانون میں جرم ہے۔

چوتھا جنیوا کنونشن جو عام آبادی کے تحفظ کے حوالے سے ہے، وہاں بھی اس کا ذکر ہے اور پہلے پروٹوکول میں بھی اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن آئی سی آر سی نے پچھلے تین چار سال سے اس پر خصوصی توجہ مرکوز کی ہوئی ہے، کیونکہ آئی سی آر سی بعض اوقات کسی مسئلہ کو اجاگر کرنے کے لیے، کسی بات پر توجہ مبذول کرانے کے لیے اس کے متعلق خاص مہم شروع کر دیتی ہے۔ اس حوالے سے قوانین کی کمی نہیں اور تمام قوانین میں اس کو واضح طور پر جرم قرار دیا گیا ہے۔ کمی صرف قانون کے نفاذ کی ہے، اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ جرم عام طور پر رپورٹ ہی نہیں کیا

جاتا۔ تو آئی سی آر سی کا اس حوالے سے جو کام ہے، وہ یہ کوشش کرتی ہے کہ ایک تو یہ کہ جہاں پر ایسی صورت حال ہو عام اصول تو یہ ہے کہ جب تک جرم ثابت نہ اس پر کوئی ایکشن نہیں لیا جاتا، لیکن آئی سی آر سی نے اس حوالے سے ایک اقدامی طریق کار اختیار کیا ہوا ہے کہ جہاں بھی اس قسم کی صورت حال پیدا ہو گی تو آئی سی آر سی یہ بات فرض کر لیتی ہے کہ وہاں پر اس قسم کے جرائم کا ارتکاب بھی ہو گا، اس لیے وہاں جا کر لوگوں کی مدد کرنی چاہیے۔ اس حوالے سے بنیادی طور پر کوشش یہ کی جاتی ہے کہ جو جنسی تشدد کا شکار ہو اس تک پہنچا جائے، تاکہ اس کا جسمانی و نفسیاتی علاج کیا جا سکے یا اس کی رضامندی سے معاملے کو ایسے فورم پر اٹھایا جائے جہاں پر مجرم کے خلاف قانونی کارروائی کی جا سکے۔ اگر اس حوالے سے کوئی اجتماعی صورت حال ہو تو آئی سی آر سی متعلقہ حکام کے ساتھ مل کر قانونی کارروائی کی کوشش کرتی ہے۔ معاملے کی پیروی کرتی ہے، جس کا ایک اثر ہوتا ہے اور ظاہر ہے بعض جگہوں پر نہیں بھی ہوتا، لیکن یہ کہ ایک کوشش اس حوالے سے آئی سی آر سی کرتی ہے، جیسا کہ دوسرے معاملات میں تشدد کی صورت میں کوشش کی جاتی ہے۔ لہٰذا ایک طرح سے جو عملی طور پر کرنے کا کام ہے آئی سی آر سی وہ کام کرتی ہے۔

بعض مقامات پر جنگ کی صورت حال نہیں ہوتی، بلکہ داخلی خلفشار کی صورت حال ہوتی ہے، اور اگر وہاں پر اس طرح کی تنظیمیں کام کر رہی ہوں تو آئی سی آر سی ان کی بھی مدد کرتی ہے اور ان کو تعاون فراہم کرتی ہے۔ جیسا کہ پاکستان میں لیگل ایڈ سوسائٹی کے نام سے کراچی میں ایک تنظیم اس حوالے سے کام کر رہی ہے اور آئی سی آر سی اس کے ساتھ تعاون کرتی ہے۔ آئی سی آر سی کی کوشش ہے کہ جو بھی متاثر ہے اس کی مدد کے لیے one stop حل کی کوئی جگہ بنائی جائے، جہاں وہ آ کر رازداری کے ساتھ یہ ساری صورت حال بتا سکے؛ تاکہ قانون نافذ کرنے والے اداروں پولیس وغیرہ تک پہنچا جا سکے۔ آئی سی آر سی اس مسئلے کو تربیت کے ذریعے بھی حل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اور اس حوالے سے اس نے کئی تربیتی پروگرام مرتب کیے ہوئے ہیں، ہمارے ہاں پاکستان میں، ڈاکٹروں کی تربیت ہوتی ہے، نرسز کی تربیت ہوتی ہے، ابتدائی طبی امداد

کرنے والوں کی تربیت ہوتی ہے۔ پولیس کے ساتھ ہمارے تربیت کے پروگرام ہوتے ہیں جو قانون اور نفاذ قانون کے حوالے سے ہوتے ہیں۔ مسلح افواج کے ساتھ بھی ہم اس حوالے سے کام کرتے ہیں یعنی نیوی، ایئر فورس اور ملٹری ان کے ساتھ بھی پروگرام ہوتے ہیں۔

ان پروگراموں میں آئی سی آر سی جا کر اپنی ٹریننگ میں ایسی چیزوں کو شامل کرتی ہے جن میں جنسی تشدد کے حوالے سے آگاہی، اس کی شدت اور اس کے بعد متاثرین کو کیسے طبی اور نفسیاتی بنیادوں پر سہارا دیا جانا چاہیے، رازداری کے ساتھ اور اس کا جو انسانی وقار ہے اس کو قائم رکھتے ہوئے، اس کے لیے بھی آئی سی آر سی عملی طور پر کوشش کر رہی ہے۔ یہ آج جو ہمارا پروگرام ہے اور ان شاءاللہ جس میں ہم آئندہ دو روز گفتگو کریں گے، یہ بھی آئی سی آر سی کی ایک کوشش ہے کہ معاشرے کے ایسے افراد جن کی رائے ایک مقام اور اثر رکھتی ہے، ان سے رابطہ کیا جائے۔

ظاہر ہے پاکستان جیسے مسلم ممالک میں جو دینی حلقے ہیں ان کا شمار سب سے موثر طبقات میں ہوتا ہے۔ اس لیے آئی سی آر سی کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ صرف اس معاملے میں ہی نہیں، بلکہ مختلف مسائل پر علما سے رہنمائی لی جائے کہ کسی مسئلے کو اسلامی تناظر میں کیسے حل کیا جائے۔ زیر غور مسئلہ ایسا ہے جس کے بارے میں کوئی بھی یہ نہیں کہے گا کہ اس کا حل نہیں ہونا چاہیے۔ اگر اس کے حل کرنے پر اتفاق ہے تو اس کو اسلام کی روشنی میں کیسے حل کیا جائے، اس کے لیے ضروری نہیں کہ یہ کہا جائے کہ بین الاقوامی قانون میں یا جنیوا کنونشن میں معاملہ اس طرح ہے، بلکہ مسلمان معاشرے میں سب سے زیادہ موثر طریقہ یہی ہے کہ یہ جرم ہے اور اسلام اس کے بارے میں یہ کہتا ہے۔ یہی بات سب سے زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔ یہ پروگرام بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے کہ ہم آپ سے سیکھیں کہ بین الاقوامی قوانین میں کوئی ایسی بات ہے جو اسلامی تعلیمات کے خلاف جا رہی ہے یا یہ کہ اس پورے مسئلے سے نمٹنے کے حوالے سے جو چیزیں ہیں اس کے بارے

میں اسلام کیا کہتا ہے۔ اس مسئلے پر اسلامی تعلیمات تو ظاہر ہے کہ بہت واضح ہیں۔ لیکن ہماری یہ کوشش ہے کہ ہم اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لیے اس پر بحث و تمحیص کریں۔

اس حوالے سے ایک بات یہ بھی ہے کہ بین الاقوامی سطح پر جو بحث ہوتی ہے اس میں اسلام کے حوالے سے سے بہت سی ایسی غلط فہمیاں بھی ہیں جو کچھ اپنوں کے غلط کرتوتوں سے یا دشمنوں کی بدنیتی کی وجہ سے شامل ہو جاتی ہیں۔ اس کی ایک مثال جو میرے ذہن میں آرہی ہے، وہ غلامی کا مسئلہ ہے۔ عام طور پر اس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ شاید اسلام نے اس کو تخلیق یا اس کو شروع کیا ہے اور آج بھی اسلام اس کی ترغیب دلاتا ہے۔ عراق میں جو گزشتہ سالوں میں ایک تنظیم کے زیر اثر علاقے میں جو صورت حال پیدا ہوئی تو اس میں جنسی غلامی کا ایک لفظ بہت استعمال ہوا، اور اس کو اسلام کے ساتھ منسلک کیا جاتا رہا ہے۔ میری ذاتی کوشش اور خواہش یہ ہے کہ اس طرح کی چیزیں صاف ہونی چاہییں کہ کیا واقعی اسلام میں اس طرح کی چیزیں ہیں یا نہیں اور اگر ہیں تو اسلام کا جو بھی صحیح موقف ہے وہ اس علمی بحث میں شامل ہو جائے۔

اس پروگرام کے حوالے سے میرے ذہن میں یہ کچھ باتیں آرہی تھیں جو میں نے آپ کے گوش گزار کر دیں۔ میری درخواست ہے کہ ان دو دنوں کے دوران ہم اس مسئلہ پر خاص توجہ مرکوز رکھیں۔ اگرچہ مسائل بہت زیادہ ہیں اور ماشاء اللہ علما حضرات جب اکٹھے ہوتے ہیں تو بہت سی چیزیں سامنے آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ لیکن ہماری کوشش یہ ہوگی کہ ہم اسی مسئلے پر توجہ رکھیں۔ اس کے علاوہ کوئی اور مسئلہ جو اگرچہ بہت اہم ہو ہم اس کو کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھیں اور اسی موضوع پر بحث کر کے کوئی مفید نتائج سامنے لے آئیں۔ آخر میں میں ایک دفعہ پھر شریعہ اکیڈمی کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور آپ لوگوں کا بھی بہت شکر گزار ہوں کہ آپ تشریف لائے۔ بارك الله لكم وبارك الله فيكم. سبحانك اللهم وبحمدك نشهد أن لا اله إلا أنت نستغفرك ونتوب إليك. السلام عليكم

استقبالیہ کلمات

پروفیسر ڈاکٹر فرخندہ ضیاء*

سب سے پہلے میں شریعہ اکیڈمی اور آئی سی آر سی کی جانب سے تمام مہمانان گرامی، مذہبی اسکالر، علمائے کرام اور خواتین وحضرات کو خوش آمدید کہتی ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہماری اس کاوش کو قبول فرمائے اور اسے ہمارے نیک اعمال میں شامل کرے۔ جہاں تک مینڈیٹ کی بات ہے تو آئی سی آر سی کا مینڈیٹ ڈاکٹر ضیاء اللہ رحمانی صاحب نے بڑے اچھے طریقے سے واضح کر دیا ہے۔ میں آئی سی آر سی کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ہمارے ساتھ اس سلگتے ہوئے اہم موضوع پر تبادلہ خیال کیا اور باہمی مشاورت سے ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ اس موضوع پر اسلامی نقطہ نظر سے بحث ومباحثہ ہونا چاہیے، یہ کانفرنس اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

اسلامی قانون اپنی نوعیت وماہیت کے اعتبار سے ایک عالمگیر قانون ہے۔ جس طرح ہم کامن لاء کی طرف رجوع کرتے ہیں، سول لاء کی طرف جاتے ہیں اور بین الاقوامی قانون سے استفادہ کرتے ہیں، اسی طرح اسلام بھی ایک مکمل نظامِ حیات ہے اور ایک جامع قانون رکھتا ہے۔ یہ ہمیں درپیش تمام مسائل کا حل فراہم کرتا ہے اور ان پر اپنا ایک نقطہ نظر رکھتا ہے۔ شریعہ اکیڈمی کا مینڈیٹ ہی یہی ہے کہ امت مسلمہ کو جو مسائل درپیش ہیں اسلامی تناظر کو واضح کر کے بین الاقوامی قانون کے ساتھ مل کر ان مسائل کا حل تلاش کریں۔ اسی لیے ہم نے اس دو روزہ کانفرنس کے عنوانات بڑی سوچ بچار کے بعد تجویز کیے ہیں؛ تاکہ ہمارے سامنے اسلام کا ایک بالکل واضح نقطہ نظر آجائے۔

آغاز تاریخی پس منظر سے کیا جانا چاہیے اور جب تاریخی پس منظر واضح ہو جاتا ہے تو ہمارے موجودہ دور میں کیا جیورس پروڈنس ہے اور نئے مسائل میں کس طرح کے فتاوی آرہے ہیں اور ان

---

* ڈائریکٹر جنرل، شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

کا حل کس طرح سے کیا جارہا ہے اور جو اس جرم کے متاثرین ہیں اگر بین الاقوامی قانون میں ان کے مسائل کا حل موجود نہیں ہے یا قانون میں خلا پایا جاتا ہے تو ہم نے ان کا حل اسلامی قانون کی روشنی میں تلاش کرنا ہے۔ اس کے لیے ایک طرف تو ہم لوگ سنگما کو ہٹائیں گے جو ہمارا فرض ہے؛ تاکہ جو غلط فہمیاں اسلام کے بارے میں دانستہ یا غیر دانستہ طور پر پیدا کر دی گئی ہیں ان کو دور کر کے اسلام کے صحیح نقطہ نظر کو واضح کر دیں اور یہ ثابت کر دیں کہ اسلام کا اس چیز کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہمارا دوسرا فرض یہ ہے کہ نئے پیش آمدہ مسائل کے حوالے سے علما سے راہنمائی لیں تاکہ کسی صحیح حل تک پہنچا جاسکے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ ہم نے اس موضوع کا پوری جامعیت کے ساتھ احاطہ کیا ہے اور اس حوالے سے احتیاطی تدابیر کو بھی زیر غور لائے ہیں۔

مجھے پوری امید ہے کہ شرکا اگر اس کانفرنس میں تمام مسائل کو پوری طرح سے حل نہ بھی کر سکے تو پھر بھی ہم کچھ نہ کچھ یہاں سے لے کے اٹھیں گے۔ میں ایک دفعہ پھر شکر گزار ہوں آئی سی آر سی کی کہ انہوں نے شریعہ اکیڈمی کے ساتھ مل کر اس اہم موضوع پر کانفرنس کا انعقاد کیا۔

خطبہ صدارت

ڈاکٹر انیس احمد *

انتہائی قابل احترام شرکائے مکالمہ اور دیگر شرکائے محفل، مجھے علمی مقالات سن کر بے انتہا خوشی بھی ہوئی ہے اور استفادے کا موقع بھی ملا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ موضوع جو آپ نے منتخب کیا ہے اور شریعہ اکیڈمی نے اس میں پہل کی ہے، یہ غیر معمولی اہم اقدام ہے اور اس کو جاری رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے محض ایک کانفرنس بالکل ناکافی ہے۔ عصری مسائل کے حوالے سے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ علما کا رویہ اور طرز عمل اس میں مدافعانہ ہے۔ اور وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ جس بحث میں الجھ جاتے ہیں وہ تاریخی ہوتی ہے یا فقہی، تجزیاتی نہیں۔ تاہم جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس میں زیادہ قصور علما کا نہیں، بلکہ اس کا سبب ہمارا نظام ہے، جس میں زیادہ زور فقہی معاملات پر ہوتا ہے نہ کہ اصول پر۔ مقاصد شریعت اگرچہ پڑھائے جاتے ہیں، لیکن طلبہ کا زیادہ زور ان انفرادی مسائل پر ہوتا ہے جن کو پڑھ کر ایک شخص مفتی بن جائے۔ پھر اس میں بھی مسالک بنیاد بن جاتے ہیں، اور ہر دینی جامعہ اپنے مسلک کی تعبیر کو ترجیح دیتی ہے اور دوسرے مسلک کی چیزوں کو چھوڑ دیتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک عام شخص شکوک و شبہات کا شکار رہتا ہے کہ کس چیز کو مانے اور کس کو چھوڑ دے۔ اس لیے ضروری ہے کہ فقہ کی جو بنیاد اور اصول ہے اس پر زور دیا جائے؛ تاکہ آئندہ دو نسلوں کے بعد کم از کم کوئی تبدیلی واقع ہو سکے۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ میں نے جو کچھ سنا ہے اس کی روشنی میں یہ بات بڑی واضح ہے کہ کیا یہ مسئلہ محض انتقامی ہے یا کچھ اور؟ اگر انتقامی ہے تو یہ انتقام کیوں ہے؟ ابھی کچھ دیر پہلے اس بات کی طرف اشارہ ہوا کہ اس میں خاندان کا بہت زیادہ دخل ہے، لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ خاندان کے علاوہ اس میں دو اور چیزوں کا دخل ہے: ایک ابلاغ عامہ اور دوسرا ہمارا نظام تدریس۔ نظام تدریس

---

* وائس چانسلر رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی، اسلام آباد

کے تحت وہ تمام چیزیں جو ہمارے غیر دینی مدارس کے اندر پڑھائی جاتی ہیں، وہ سب کی سب ایک انسان کو فرد تو بناتی ہیں، لیکن معاشرے کا فرد نہیں بناتیں۔ اس بنا پر اس کا پورا زاویہ حیات، زندگی کے بارے میں تصور، self egocentric بن کر اس صورت میں ظاہر ہوتا ہے کہ دوسروں کے حقوق، دوسروں کا وجود، اس کے لیے غیر متعلق ہو جاتے ہیں۔ وہ اس کو غور میں لائے بغیر، اس پر سوچے سمجھے بغیر، محض اپنی رائے اور اپنے فیصلے کو نافذ کرنا اپنا حق اور فرض سمجھتا ہے۔ اور یہی جذبہ انتقام میں بھی کارفرما ہوتا ہے، گویا اس سارے مسئلہ کی جڑ محض جنسی بھوک نہیں، بلکہ وہ تعلیم ہے جو آپ نے بچپن سے اسے دی ہے۔ میں اس تعلیم کی بات کر رہا ہوں جو سیکولر ہے۔ اور یہ عین فطری بات ہے کہ اس نظام تدریس میں اسے جو کچھ بنایا جا رہا ہے وہ وہی کچھ بنے گا، یعنی انفرادیت پسند، خود رائی کا قائل۔ یہی رویہ جذبہ انتقام میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔

دوسری اہم چیز ابلاغ عامہ کا کردار ہے۔ ابلاغ عامہ نے جس طرح انتہائی گھناؤنے جرائم جو کسی بھی انسانی معاشرے میں قابل نفرت ہونے چاہییں، ان کو قابلِ برداشت اور ایک معمول کی چیز بنا دیا ہے کہ یہ تو معاشرے میں ہو رہا ہے، ہم کیا کر سکتے ہیں۔ ہم اگر یہ نہیں کریں گے تو کون ہمیں دیکھے گا، سنے گا۔ لہٰذا اس پہلو پر اشد ضرورت ہے کہ ایک اجتماعی شعور پیدا کیا جائے اور یہ کوئی اور پیدا نہیں کرے گا، نہ دینی جماعتیں اور نہ سیاسی جماعتیں، بلکہ یہ آپ کے ذریعے سے پیدا ہو گا؛ لہٰذا جو لوگ جامعات کا حصہ ہیں، ان پر فرض ہے کہ ان موضوعات کو اجتماعی شعور میں تبدیل کریں، اس کے بغیر یہ کام آگے نہیں بڑھ سکتا۔ یہ اجتماعی شعور ہی ہے جو لوگوں کو بہت سی باتوں سے بچنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ دیکھیے، آج ہم کہتے ہیں کہ کرپشن ہے، اس کی بنیاد کیا ہے؟ لوگوں نے جھوٹ اور رشوت وغیرہ کو اتنی آسانی سے برداشت کر لیا ہے، اپنی وفاداریاں بدلنے کو سیاست کا حصہ سمجھ لیا گیا ہے کہ اس کا تعلق دین سے نہیں ہے۔ یہاں تک کہ جو حضرات اپنا تعلق دین سے ظاہر کرتے ہیں، خود کو دین دار سمجھتے ہیں، وہ بھی ان تمام معاملات کے اندر برابر کے شریک ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان چیزوں کو اجتماعی شعور کی حیثیت سے اجاگر کرنے

کے لیے جامعات اپنا کردار ادا کریں۔ آپ لوگوں کی طرف سے ان موضوعات پر مسلسل ایسے ندوات کا انعقاد ہوتے رہنا چاہیے۔

ایک اور چیز جو بڑی اہم ہے، وہ ہدایات کا معاملہ ہے۔ جو ہدایات ہم سنت میں دیکھتے ہیں اور خلفاء بھی اس پر عمل پیرا رہے کہ دوران جنگ فلاں فلاں کام نہ کیے جائیں، ان ہدایات کو لازمی طور پر ہماری فوجی تربیت کا حصہ ہونا چاہیے۔ لیکن اگر آپ پہلے پہلو کو اختیار کرلیں کہ ان کی اولین تربیت نظام تعلیم کے ذریعے ہو، پھر دوسرے پہلو کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس لیے کہ برائی سے بچنا اور بھلائی کو پھیلانا اس کے مزاج کا حصہ بن جائے گا۔

ایک اور چیز جو میں چاہتا ہوں آپ کے سامنے رکھوں کہ بلاشبہ ہم جس غلامی کی بات کر رہے ہیں اس سے زیادہ اہم سامراجی غلامی، ثقافتی غلامی اور الفاظ و اصطلاحات کی غلامی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اسلام کو بھی ان اصطلاحات کی مدد سے پیش کریں جو مغرب میں بہت رائج ہو چکی ہیں۔ اگر کسی مغربی مستشرق نے یہ کہہ دیا کہ یہ تو پوسٹ اسلام ازم کا دور ہے، تو اب یہ مسلمان اہل علم کے لیے فرض ہو گیا کہ وہ کھینچ تان کے ثابت کریں کہ واقعی جو بات کہی گئی ہے وہ اسلام کے اندر پائی جاتی ہے اور ہم بطور مسلمان شہادت دیتے ہیں کہ یہ چیز بہت قابلِ فخر ہے۔ یہ جو سامراج کی غلامی ہے وہ اصطلاحات کی بھی ہے اور علمی بھی۔ دانش مندوں یا دانشوروں کی گفتگو ہوتی ہے، وہ ساری انہی اصطلاحات میں ہوتی ہے جو مغربی مستشرقین استعمال کرتے ہیں اور ہم خوش ہوتے ہیں کہ ماشاءاللہ ہم عصری مباحث میں حصہ لے رہے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ ہمیں ان چیزوں سے نکلنے کی ضرورت ہے۔ بالخصوص بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، شریعہ اکیڈمی جس کا ایک ذیلی ادارہ ہے، بنی ہی اس لیے تھی کہ وہ ایسے رجال کار پیدا کرے جو اجتہادی بصیرت رکھتے ہوں، مگر ہم نے اس کو عملاً مسلکی مقلدین کا ادارہ بنا دیا۔ میں چونکہ ان لوگوں میں سے ایک ہوں جنہوں نے اس ادارے کی بنیاد رکھی تھی اور جب میں دیکھتا ہوں کہ اس میں وہ تبدیلیاں ہو چکی ہیں جو کبھی ناقابل تصور سمجھی جاتی تھیں تو مجھے بہت تکلیف

پہنچتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمارے دینی مدارس کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ معاشرے کو ایسے افراد مہیا کریں جو اجتہادی شان رکھتے ہوں۔ اور یہ صرف اسی وقت ہو سکتا ہے جب مدارس اپنے نظام تعلیم میں مقاصد شریعت کو وسیع پیمانے پر زیر غور لائیں۔ جیسا کہ ڈاکٹر طاہر منصوری صاحب نے فرمایا: ابن عاشور کا اگر آپ مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ہم جو پانچ بنیادی مقاصد لیے بیٹھے ہیں وہ کتنی محدود فکر ہے اور اس میں کتنی گنجائشیں اور وسعتیں ہیں۔ جو آپ نے ذکر کیا باندیوں کا، غلامی کا اور دیگر چیزوں کا بلاشبہ حریت پر ہمارے فقہانے بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن اگر توحید کے مطالب پر غور کر لیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ یہ غلامی کا تصور توحید کے منافی ہے۔ ایک شخص رب کا غلام تو ہو سکتا ہے لیکن کسی شخص کا غلام نہیں ہو سکتا۔ اس لیے مسئلہ یہ نہیں کہ جو بتایا جاتا ہے کہ کن بزرگوں کے پاس اتنے غلام تھے، باندیاں تھیں یا نہیں تھیں، بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس پر مختلف زاویوں سے غور کیا جائے اور جیسا کہ میں نے گزارش کی کہ جب تک ہم مغرب یا سامراجی غلامی سے، بلکہ معاصر مسلم متجددین کی فکر کو حتمی سمجھنے کی سوچ سے باہر نہیں نکلیں گے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا؛ کیونکہ کسی بھی انسان کی فکر حتمی نہیں ہو سکتی، چاہے وہ کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہ ہو، اس کے علم کو تنقیدی نگاہ سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

ہم اسی بات میں لگے رہتے ہیں کہ فلاں کا ذکر حاشیہ میں آگیا تو مضمون زور دار ہو گیا۔ حالانکہ بحث یہ نہیں ہے کہ آپ مضمون کتنا زور دار بیان کر رہے ہیں، بلکہ اصل چیز یہ دیکھنے کی ہے کہ جو دین کے مقاصد ہیں وہ کس حد تک اس سے پورے ہو رہے ہیں، لیکن اس چیز کو ہم بھول جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو قواعد فقہیہ ہیں ان میں اتنی وسعت ہے کہ آپ ان میں سے کسی ایک قاعدے کی بنیاد پر پورا نظام حکومت چلا سکتے ہیں۔ مثلاً مصلحت عامہ کا جو اصول ہے، اگر آپ اس کا مطالعہ کریں تو تنہا اسی ایک اصول کی روشنی میں بہت سے فیصلے کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ مثلاً جو سد ذرائع کا اصول ہے یا دیگر اصول ہیں ان کی بنیاد پر آپ بہت سے معاملات حل کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کی بجائے ہم کیا کرتے ہیں کہ طالب علم کو کسی ایک بزرگ کے فتاوی یا کچھ فقہی نصوص

ازبر کروادیتے ہیں؛ تاکہ کم سے کم یہ ہو سکے کہ مدرسے کا فاضل کل کسی انتظامی پوسٹ پر بیٹھ کر کوئی ادارہ چلا سکے۔ جب تک ہمارے ذہن کی یہ روش تبدیل نہیں ہوگی ہمارا بیانیہ نہیں آسکتا۔ اور ضرورت اس وقت ایسے بیانیہ کی ہے جو کہ مدافعانہ نہ ہو، بلکہ ایجابی ہو اور اس کی بنیاد صرف قرآن وسنت ہو۔ ان دونوں مصادر کی بنیاد پر جب تک کوئی بیانیہ نہیں لائیں گے اس وقت تک مسائل سامنے آتے رہیں گے۔ اس کے لیے ابلاغ عامہ کی ضرورت ہے۔ جس کے لیے کوئی نہ کوئی کوشش ہوتی رہنی چاہیے۔ اگر آپ کو تجدد پسند چینل نہ بلائیں تو آپ کے پاس سوشل میڈیا موجود ہے۔ آپ اس کا سہارا لیں اور اس کے لیے نوجوانوں کو سامنے لائیں۔ آپ کے پاس جامعات میں میڈیا سائنسز کے شعبہ جات ہیں ان میں سے طبع زاد لکھنے والے نوجوانوں سے آپ اس مقصد کے لیے کام لیں۔ آپ پر اپنے بیانیے کو پھیلانے کے لیے سوشل میڈیا کے استعمال پر کوئی قید نہیں۔ رہی بات میڈیا چینلز کی وہ تو بکے ہوئے ہیں اور ان کے سیاسی مسالک بہت برہنہ ہیں۔ ان کے مقاصد ڈھکے چھپے نہیں، بلکہ بہت واضح ہیں اور وہ ان کا کھلے عام پرچار کرتے ہیں۔ اس لیے آپ کو کو ان کی ضرورت ہی نہیں۔

اس طرح کے علمی اجتماعات کثرت سے ہونے چاہییں، تاکہ آپ کی باتیں وسیع پیمانے پر لوگوں تک پہنچ سکیں۔ اور ان اجتماعات میں دینی اداروں کے سربراہان کو بلا کر ان سے بلا تکلف ان موضوعات پر گفتگو کی جائے؛ کیونکہ ایسی مجالس میں ہی وہ آپ کی بات سن سکتے ہیں۔ دیگر مجالس میں ان کے لیے آپ کی بات سننا مشکل ہوتا ہے، کیونکہ وہاں وہ صرف اپنی بات بیان کرنا چاہتے ہیں۔ البتہ اس طرح کی علمی مجالس میں وہ آپ کی بات کو رواداری کے ساتھ سن بھی لیتے ہیں اور اس کے اثرات بھی ہوتے ہیں۔ اس علمی جمود کو توڑنا کسی اور ادارے کے بس کی بات نہیں، اس کام کو صرف جامعات کر سکتی ہیں۔

آخر میں میں اس بات پر اظہار رائے کرنا چاہتا ہوں کہ جب بھی عورتوں کے مسائل کے حوالے سے گفتگو ہوتی ہے تو اس پر اظہار رائے کرنے والے عموماً مرد حضرات ہوتے ہیں، اور وہ یہ

بات باور کرانا چاہتے ہیں کہ عورتوں کو جو حقوق دیے جا چکے ہیں وہ بھی کافی سے زیادہ ہیں۔ اس حوالے سے میرا خیال یہ ہے کہ ان مسائل پر گفتگو علمی بنیادوں پر ہونی چاہیے، نہ کہ جنسی بنیادوں پر۔ میں اس بات کا قائل نہیں کہ اس طرح کے موضوعات عورتوں کی نمائندگی کے بغیر مکمل نہیں ہوتے، بلکہ اگر کوئی عورت علم رکھنے والی ہے تو وہ ضرور ایسی مجالس میں اپنی رائے کا اظہار کرے۔ یہ جو ہمارے ہاں جنسی نمائندگی کا تصور پایا جاتا ہے، کم از کم میرے علم کے مطابق اس کی کوئی شرعی بنیاد موجود نہیں؛ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو نبوت بھی لازمی طور پر خواتین کو ملنی چاہیے تھی۔ لہٰذا یہ ایک غیر شرعی مطالبہ ہے کہ خواتین کی نمائندگی کے بغیر ان مسائل پر گفتگو نہیں ہو سکتی۔

ایک انتہائی اہم نکتہ یہاں پر یہ بھی ہے کہ جتنے بھی دینی نوعیت کے ہدایت نامے پائے جاتے ہیں، ان میں یہ ہدایت ہے کہ عورت روٹی بنائے، لباس اور گھر کی تزئین کرے۔ لیکن شوہر کیسے اس کے ساتھ گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹائے، اس کے ساتھ کیسے تعاون کرے، اس پر کوئی زور نہیں۔ اس طرح یہ ایک یک طرفہ تصور بن جاتا ہے اور اس کی بھی توازن کے ساتھ اصلاح کی ضرورت ہے۔ اس بنا پر نہیں کہ آپ کو کہا جائے گا کہ آپ ایک جدید سوچ (modernist approach) اختیار کر کے زیادہ دین دار بن گئے ہیں، بلکہ اس بنا پر کہ یہ تقاضائے عدل ہے جو کہ ہمارا بنیادی اصول ہے۔ اور عدل یہ ہے کہ ہم دونوں کو یکساں طور پر ہدایت فراہم کریں اور ان کی تربیت کریں۔

میں یہاں پر دوبارہ آپ لوگوں کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے استفادے کا موقع دیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے اس عمل میں برکت دے اور آئندہ بھی ایسی نشستیں منعقد ہوتی رہیں، جن میں اہل علم کو نئے افق تلاش کرنے کا موقع ملے اور ہم اس دور کے لحاظ سے ایک غیر مدافعانہ بیانیہ مرتب کر سکیں۔

مسلح تصادم اور اندرونی خلفشار کے دوران جنسی تشدد: احتیاطی اقدامات

پروفیسر ڈاکٹر فرخندہ ضیاء[1]

مسلح تصادم کے دوران جنسی تشدد عہدِ حاضر کا ایک سنگین مسئلہ ہے جس نے شرف انسانی کو بری طرح ٹھیس پہنچائی ہے۔ دورانِ جنگ اسے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے جس کا بنیادی مقصد فریق مخالف کے افراد کو ذلیل ورسوا کرنا اور ان کے دلوں میں دہشت کی فضا قائم کرنا ہے۔ ماضی قریب میں دوران جنگ اور اندرونی خلفشار کے دوران کمزور اور بے بس خواتین کی عصمت دری کے متعدد واقعات پیش آئے ہیں۔ روہنگیا مسلمانوں کے ساتھ ہونے والے ظلم وستم اور اس سے قبل بوسنیا میں جو جنگی جرائم کا ارتکاب کیا گیا کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اسی طرح عراق اور شام میں نام نہاد دولت اسلامیہ کی جانب سے یزیدی فرقے کے لوگوں پر جو ظلم کے پہاڑ توڑے گئے وہ بھی ساری دنیا کے سامنے ہے۔ ان جنگی جرائم نے جن میں جنسی تشدد سرفہرست ہے انسانی ضمیر کو بری طرح جھنجوڑا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بین الاقوامی قانون میں ہر طرح کے جنسی تشدد کو نہ صرف قابل سزا جرم قرار دیا گیا ہے، بلکہ اس کی روک تھام کے لیے متعدد اقدامات تجویز کیے گئے ہیں۔ انٹرنیشنل ریڈ کراس کمیٹی اس حوالے سے موثر کردار ادا کر رہی ہے۔

اس تناظر میں یہ بات انتہائی اہمیت اختیار کر گئی ہے کہ جنسی تشدد کے حوالے سے شریعت اسلامیہ نے جو احکامات دیے ہیں ان کو مربوط انداز میں سامنے لایا جائے، تاکہ ان تعبیرات وتاویلات کی غلطی واضح ہو جائے جن کی بنا پر بعض اوقات جنسی تشدد کے کچھ رویوں کو اسلام کی بنیاد پر جواز بخشا جاتا ہے۔ زیر نظر مقالے میں اسلام میں جنسی تشدد کی روک تھام اور پیش بندی کے طور پر جو احتیاطی اقدامات تجویز کیے گئے ہیں ان کا جائزہ لینا مقصود ہے۔ قبل اس کے کہ

۱۔ میں اس مقالے کی تیاری میں تعاون پر حافظ احمد وقاص لیکچرر شریعہ اکیڈمی بین الاقوامی یونیورسٹی کی شکر گزار ہوں۔

جنسی تشدد کے بارے میں اسلامی تعلیمات کا جائزہ لیا جائے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بین الاقوامی قانون میں جنسی تشدد کا جو تصور پایا جاتا ہے اس کی وضاحت کر دی جائے۔

بین الاقوامی قانون میں جنسی تشدد کا مفہوم

اس وقت بین الاقوامی قانون میں جنسی تشدد سے جو مفہوم مراد لیا جاتا ہے اس کے بنیادی نکات درج ذیل ہیں:

- جنسی تشدد صرف عورتوں کے ساتھ خاص نہیں بلکہ یہ عمل بالغ افراد، بچوں، عورتوں، مردوں اور ہر قسم کے کمزور و بے بس لوگوں کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ البتہ ان میں بعض افراد دوسروں کی نسبت آسان ہدف ہوتے ہیں؛ اسی لیے وہ تشدد کا زیادہ نشانہ بنتے ہیں۔
- مسلح تصادم کے دوران جنسی تشدد میں وہ تمام جنسی افعال شامل ہیں جو کمزور و بے بس خواتین، بچوں اور مردوں کے خلاف روا رکھے جاتے ہیں۔ بین الاقوامی قانون اور حقوق انسانی کے معاہدات کی رو سے جنسی تشدد میں جنسی زیادتی سے تعلق رکھنے والا ہر فعل شامل ہے چاہے عملاً جنسی فعل کا ارتکاب نہ بھی ہو۔ عورتوں کو جنسی طور پر ہراساں کرنا، انہیں برہنا کرنا، برہنگی کی تصاویر اور فلمیں بنانا اور ان کی تشہیر کرنا، گھریلو تشدد یعنی شوہروں کا بیویوں پر جسمانی تشدد، عورت کی جبری شادی، جبری حمل، بچوں کا جنسی استحصال، جنس نگاری کو دیکھنے یا اس میں حصہ لینے پر مجبور کرنا یہ سب جنسی تشدد کا حصہ ہیں۔ تاہم عورت کے ساتھ جبری جنسی فعل جنسی تشدد کی سب سے معروف اور نمایاں شکل ہے۔
- جنسی تشدد صرف جنسی افعال تک ہی محدود نہیں رہتا، بلکہ بہت سے دیگر افعال بھی اس کا حصہ ہوتے ہیں۔ ان میں قتل عام، املاک کی تباہی، بچوں اور عورتوں کا اغوا، بردہ فروشی، جبری قحبہ گری، جبری شادی جیسی کارروائیاں شامل ہیں۔

جنسی تشدد اور اسلام کا موقف

جنسی تشدّد چاہے وہ کسی بھی شکل میں ہو اور کسی بھی فرد پر ہو، اسلام اس کی سختی سے مذمت کرتا ہے۔ شریعت اسلامیہ میں جو احکام دیے گئے ہیں ان کا بنیادی مقصد دین، جان، عقل، نسل اور مال کا تحفظ ہے۔ بعض علما نے اس میں عزت و آبرو کی حفاظت کا اضافہ کیا ہے۔ لیکن جمہور کے ہاں عزت کا تحفظ درحقیقت جان یا نسل کے تحفظ میں شامل ہے۔ عزت کے تحفظ کو مستقل مقصد قرار دیا جائے یا کسی اور مقصد کے ذیل میں رکھا جائے اس بات پر فرق نہیں پڑتا کہ شریعت اسلامیہ میں عزت و آبرو کے تحفظ کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے، جیسا کہ اس سلسلے میں دیے گئے احکام سے واضح ہوتا ہے۔

شریعت کے ان مقاصد، جن میں عزت کا تحفظ شامل ہے، کے حصول کے لیے دو طرح کے احکام دیے گئے ہیں۔ پہلے وہ احکام جو ایجابی پہلو سے دیے گئے ہیں یعنی جو ان مقاصد کو وجود میں لانے کا سبب بنتے ہیں اور دوسرے وہ احکام جو سلبی پہلو سے دیے گئے ہیں، جن کے تحت ہر اس فعل کا سدِباب کیا گیا ہے جو ان مقاصد کی بقا کے لیے خطرہ کا باعث ہے۔ اس تحریر میں صرف ان احکام سے اعتنا کیا گیا ہے جو عزت و آبرو کے تحفظ کی خاطر احتیاطی اقدامات کے طور پر دیئے ہیں۔ ان احکام کی تفصیل سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند تمہیدی باتوں کی وضاحت کر دی جائے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کئی معاصر اہل علم نے مقاصد شریعت کی معروف پنجگانہ فہرست کو بڑھاتے ہوئے کئی نئے امور کو بھی اس فہرست میں شامل کیا ہے، جیسے حریت انسانی، امن و امان کا قیام اور غربت کا خاتمہ وغیرہ؛ تاہم اگر بغور جائزہ لیا جائے تو ان میں سے اکثر امور وہ ہیں جو بذات خود کلی اور جداگانہ حیثیت نہیں رکھتے، بلکہ ان کو پانچ بنیادی مقاصد کے ذیل میں رکھا جا سکتا ہے اور اصل حیثیت بنیادی مقاصد کو ہی حاصل ہے۔[1] پھر دوسرا یہ کہ فقہا نے بنیادی مقاصد کی اہمیت کی بنیاد پر سہ گانہ تقسیم بھی کر رکھی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے ضروریات کو رکھا

۱۔ دیکھیے: ابن عاشور، مقاصد الشریعۃ الاسلامیۃ (وزارت اوقاف قطر، ۲۰۰۴)

گیا ہے یعنی وہ امور جن کے بغیر ان مقاصد کا وجود ممکن نہیں ہوتا۔ دوسرا نمبر حاجیات کا آتا ہے یعنی جن کے بغیر ان مقاصد کے حصول میں مشقت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور آخر میں تحسینیات کا نمبر آتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ناموس کے حوالے بعض احکام ضروریات کے درجے میں ہوں گئے یعنی جن کی بجاآوری لازمی یا ان سے رکنا ضروری ہو گا جیسے بعض صورتوں میں نکاح کا لازم ہونا۔ پھر کچھ احکام ایسے ہوں گے جو حاجیات میں شمار ہوتے ہیں جیسے قذف سے متعلق احکام، اور اسی طرح کچھ احکام کی حیثیت تحسینیات کی ہو گئی جیسے نظروں کو نیچے رکھنا۔

اسلام میں بین الاقوامی قانون بشمول قانون انسانی کے نفاذ کا مسئلہ

قانون کے موجودہ تصور کے مقابلے میں شریعت اپنے اندر ایک وسیع مفہوم لیے ہوئے ہے۔ یہ چند قانونی اوامر پر مشتمل ایک نظام نہیں جس کی تنفیذ کے لیے ریاست، ادارے یا کسی معاہدے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بلکہ شریعت ایک جامع نظام ہے، جس کی عمارت عالمگیریت کی بنیاد پر اٹھائی گئی ہے۔ اس نظام میں فرد نہ صرف یہ کہ قانونی لحاظ سے بلکہ دینی اور اخلاقی پہلو سے بھی اس کے احکام پر عمل پیرا ہونے کا پابند ہوتا ہے، اور یہ کہ اس کے لیے لازمی طور پر کسی قوتِ نافذہ کا ہونا ضروری نہیں۔ ایک مسلمان اللہ کے سامنے جوابدہی کا احساس رکھتا ہے اور ہر حال میں اپنے اوپر شریعت کے احکام کی پابندی لازم سمجھتا ہے، چاہے وہ اسلامی ریاست میں ہے یا میدان جنگ میں دشمن سے برسرپیکار ہے۔ اس ضمن میں امام محمد کا یہ قول المسلم ملتزم بحکم الإسلام حیث ما یکون[1] فقہ اسلامی کا ایک اہم قاعدہ ہے جو زیر بحث تصور کی تائید کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر اسلام میں ملکی قوانین کے نفاذ کے لیے جو قوت کارفرما ہوتی ہے وہی قوت نافذہ اس کے بین الاقوامی قانون کے پیچھے کارفرما ہوتی ہے۔[2] یہی وجہ ہے کہ ماضی میں جنگ کے آداب اور

۱۔ سرخسی، شرح السیر الکبیر ۱: ۱۸۸

2. Dr. Mehmood Ahmad Ghazi, Shorter Book on Muslim International Law (Islamabad: Islamic Research Institute, 1998) P.19

اصولوں کی تنفیذ کے لیے مسلمانوں کو ان مسائل کا بہت کم سامنا کرنا پڑا ہے جو آج کل قانون انسانی کے نفاذ میں دنیا کو درپیش ہیں۔

اسلامی بین الاقوامی فوجداری قانون اور قانون انسانی

اوپر والی بات سے یہ امر خود واضح ہو جاتا ہے کہ شریعت اسلامیہ میں ملکی اور بین الاقوامی سطح پر الگ الگ احکام نہیں دیے گئے۔ اسلامی ریاست کے اندر ایک فرد کے لیے جن افعال کو حرام قرار دیا گیا ہے دشمن کی سرزمین پر بھی وہ اس کے لیے حرام ہی رہتے ہیں۔ امام ابو یوسف نے یہ بات یوں بیان کی ہے: لا يجوز للمسلم في دار الحرب إلا ما يجوز له في دار الإسلام[1] (دارالحرب میں ایک مسلمان کے لیے صرف وہی امر جائز ہے جو دارالاسلام میں اس کے لیے جائز ہو گا)۔ ہاں یہ بات درست ہے کہ دوران جنگ ناگزیر صورتوں کے لیے کچھ استثنائی احکام ضرور ملتے ہیں، لیکن ان کی حیثیت ایک استثنا کی ہے اور انہیں صرف بقدر ضرورت ہی لیا جا سکتا ہے۔ اسلام میں انسانی قانون کے حوالے سے جو بات زیادہ اہم ہے وہ یہ کہ عام ہدایات کے ساتھ ساتھ خصوصی احکام بھی دیے گئے ہیں؛ تاکہ ایک مسلمان مجاہد کو واضح طور پر معلوم رہے کہ اگرچہ وہ دشمن سے برسرپیکار ہے، لیکن یہ کام اس کے لیے کسی طور پر جائز نہیں۔

اس گفتگو سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں شرف انسانی اور عزت کے تحفظ کے لیے جو ہدایات دی گئی ہیں ان کا اطلاق صرف اسلامی ریاست کے اندر ہی نہیں ہوتا جہاں مسلمانوں کی عمل داری ہو، بلکہ یہ عالمگیر ہدایات ہیں اور دوران جنگ اور مسلح تصادم میں بھی ان پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔

سد ذریعہ

تمہیدی امور کے طور پر آخری بات یہ ہے کہ بعض اوقات جائز اور مباح کاموں کو اس بنیاد پر ممنوع قرار دے دیا جاتا ہے کہ وہ حرام کام کا سبب اور ذریعہ بن رہے ہوتے ہیں۔ شریعت میں

۱۔ کاسانی، بدائع الصنائع ۷: ۱۳۲

اسے سد ذریعہ کا اصول کہا جاتا ہے۔ جیسے اگر کسی خاص علاقے میں انگور کی کاشت شراب کی پیداوار کے لیے استعمال ہو رہی ہو تو اس علاقے میں انگور کی کاشت پر پابندی لگائی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اسی اصول کی بنا پر حکومت وقت کے پاس یہ اختیار ہے کہ وہ ایسے ان کاموں پر پابندی عائد کر دے جو عزت و ناموس کے تحفظ میں رکاوٹ کا باعث بن رہے ہوں۔

اسلام میں تکریم انسانی کا تصور

شریعت کے اوّلین ماخذ یعنی قرآن مجید میں تکریم انسانی کے حوالے سے تفصیلی ہدایات دی گئی ہیں جن میں چند ایک درج ذیل ہے: ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلا﴾ [بنی اسرائیل ۱۷: ۷۰] (ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انہیں خشکی و تری میں سواریاں مہیا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی)۔ تکریم انسانی کے اس تصور کی وضاحت رسول اللہ ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر یوں فرمائی: ألا دماؤكم وأموالكم وأعراضكم حرام عليكم كحرمة يومكم هذا في شهركم هذا في بلدكم هذا[1] (سنو! تمہاری جان، مال، آبرو ایک دوسرے کے لیے اسی طرح مقدس اور قابل احترام ہیں جیسے آج کا دن، آج کا مہینہ اور تمہارا یہ شہر)۔

اس حدیث میں عزتِ انسانی کو واضح طور پر مقدس اور قابل احترام قرار دیا گیا ہے اور اس پر جس چیز سے سب سے زیادہ زَد پڑتی ہے وہ جنسی تشدد اور غیر اخلاقی سلوک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جنسی تشدد کے حوالے سے نہ صرف سخت اور قرار واقعی سزائیں تجویز کی ہیں، بلکہ اس کی روک تھام کے لیے کئی احتیاطی اقدامات کا بھی کہا ہے۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب قول النبی ﷺ: "رب مبلغ أوعى من سامع"، حدیث ۶۷

جنسی تشدد: احتیاطی اقدامات

شریعت اسلامیہ میں جنسی بے راہ روی اور تشدد سے حفاظتی اقدامات کے طور کئی احکام دیے گئے ہیں۔ قرآن مجید میں سورہ نور میں مسلمان مردوں کو یہ ہدایت دی گئی کہ وہ اپنی نظروں کی حفاظت کریں؛ اس لیے کہ یہ نظر ہی ہے جس سے تمام فتنوں کے دروازے کھلتے ہیں۔ اس بنا پر قرآن حکیم نے بے حیائی کے انسداد کے لیے اسی پر پابندی لگائی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے: ﴿قُل لِّلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ ذٰلِكَ أَزْكَىٰ لَهُمْ إِنَّ اللهَ خَبِيرٌ بِمَا يَصْنَعُونَ﴾ [النور ۲۴: ۱۷] (اے پیغمبر مسلمان مردوں سے کہہ دے [عورتوں کے سامنے آئیں تو] اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنے ستر کی نگہداشت سے غافل نہ ہوں۔ یہ ان کے لیے زیادہ پاک نفسی کا طریقہ ہو گا۔ وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے علم سے پوشیدہ نہیں)۔

کسی مرد یا عورت کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ کسی غیر محرم کو بنظر شہوت دیکھے، حدیث میں ہے کہ اس طرح غیر محرم کو دیکھنا آنکھوں کا زنا شمار ہوتا ہے، پہلی نظر اچانک پڑ جائے تو معاف ہے مگر دوسری معاف نہیں ہے۔

دوسری طرف عورتوں کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ گھروں میں بیٹھیں، زمانۂ جاہلیت کی طرح بناؤ سنگھار سے گریز کریں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الأُولَىٰ وَأَقِمْنَ الصَّلاةَ وآتِينَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللهَ وَرَسُولَهُ﴾ [الاحزاب ۳۳: ۳۳] (اور اپنے گھروں میں بیٹھی رہو اور گزشتہ زمانہ جاہلیت کی طرح بناؤ سنگھار دکھاتی نہ پھرو، اور نماز پڑھو اور زکاۃ دو اور اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو)۔

اسی طرح شرم گاہوں کی حفاظت کے حوالے سے یہ ہدایات دی گئیں: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ﴾

[المومنون ۲۳: ۵- ۶] (اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں مگر اپنی بیویوں سے یا [کنیزوں سے] جو ان کی مِلک ہوتی ہیں کہ [ان سے] مباشرت کرنے سے انہیں ملامت نہیں)۔

اس آیت اور اس کے بعد والی آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ ایمان والے زنا اور زنا کے اَسباب و لَوازمات وغیرہ حرام کاموں سے اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں؛ البتہ اگر وہ اپنی بیویوں اور شرعی باندیوں کے ساتھ جائز طریقے سے صحبت کریں تو اس میں ان پر کوئی ملامت نہیں۔

اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا﴾ [الاسراء ۱۷: ۳۲] (اور زنا کے قریب نہ جاؤ، بے شک وہ ہمیشہ سے بڑی بے حیائی ہے اور برا راستہ ہے)۔

اس آیت میں نہ صرف زنا سے منع کیا گیا ہے، بلکہ زنا کی قربتوں اور راستوں سے بھی روکا گیا ہے اور زنا کو بے حیائی اور برا راستہ قرار دیتا ہے۔ اس لیے جن راستوں اور واسطوں کے ذریعے آدمی زنا کا مرتکب ہوتا ہے۔ ان سے اجتناب کرنے کا سختی کے ساتھ حکم دیا گیا ہے۔ زنا ایسا برا عمل ہے جو آدمی سے یک دم سرزد نہیں ہوتا، بلکہ پہلے کچھ اقدامات اور حرکات کرنا پڑتی ہیں۔ یہ آیت ان اقدامات اور حرکات سے بھی روکتی ہے۔

اسلام میں انسانی عزت و آبرو کے تحفظ کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے کو حدود جرائم میں شامل کیا گیا ہے اور اس کے لیے قذف کی حد مقرر کی گئی ہے۔ سورہ نور میں ارشاد ربانی ہے: ﴿وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً وَلا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا وَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ [النور ۲۴: ۴] (اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں اور پھر چار گواہ نہیں لاتے تو انہیں اسّی درّے مارو اور کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو، اور وہی لوگ نافرمان ہیں)۔

مولانا مودودی اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں: اس حکم کا منشا یہ ہے کہ معاشرے میں لوگوں کی آشنائیوں اور ناجائز تعلقات کے چرچے قطعی طور پر بند کر دیے جائیں کیونکہ اس سے

بے شمار برائیاں پھیلتی ہیں اور ان میں سب سے بڑی برائی یہ ہے کہ اس طرح غیر محسوس طریقے پر ایک عام زناکارانہ ماحول بنتا چلا جاتا ہے۔ ایک شخص مزے لے لے کر کسی کے صحیح یا غلط گندے واقعات دوسروں کے سامنے بیان کرتا ہے، دوسرے اس میں نمک مرچ لگا کر اور لوگوں تک انہیں پہنچاتے ہیں اور ساتھ ساتھ کچھ مزید لوگوں کے متعلق بھی اپنی معلومات یا بدگمانیاں بیان کر دیتے ہیں۔ اس طرح نا صرف یہ کہ شہوانی جذبات کی ایک عام رو چل پڑتی ہے بلکہ برے میلانات رکھنے والے مردوں اور عورتوں کو یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ معاشرے میں کہاں کہاں ان کے لیے عصمت آزمائی کے مواقع موجود ہیں۔ شریعت اس چیز کا سدباب پہلے ہی قدم پر کر دینا چاہتی ہے۔ ایک طرف وہ حکم دیتی ہے کہ اگر کوئی زنا کرے اور شہادتوں سے اس کا جرم ثابت ہو جائے تو اس کو وہ انتہائی سزا دی جائے جو کسی اور جرم پر نہیں دی جاتی اور دوسری طرف وہ فیصلہ کرتی ہے کہ جو شخص کسی پر زنا کا الزام لگائے وہ یا تو شہادتوں سے اپنا الزام ثابت کرے یا پھر سزا کے لیے تیار ہو جائے۔[1]

اسی طرح اس بات کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے کہ کسی کو غیر اخلاقی فعل پر مجبور کیا جائے: ﴿وَلا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِتَبْتَغُوا عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَنْ يُكْرِهْهُنَّ فَإِنَّ اللهَ مِنْ بَعْدِ إِكْرَاهِهِنَّ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ [النور ۲۴: ۳۳] (اور اپنی لونڈیوں کو اپنے دنیوی فائدوں کی خاطر قحبہ گری پر مجبور نہ کرو جبکہ وہ خود پاک دامن رہنا چاہتی ہوں، اور جو کوئی ان کو مجبور کرے تو اس جبر کے بعد اللہ ان کے لیے غفور و رحیم ہے)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مالک جبر کر کے اس سے پیشہ کرائے تو وہ اس کا ذمہ دار ہو گا اور وہی پکڑا جائے گا۔

اس بات کی تائید رسول اکرم ﷺ کی ایک حدیث مبارکہ سے بھی ہوتی ہے جس میں رسول کریم ﷺ نے جسم فروشی اور کاہن کی کمائی اور پیسے لینے سے منع فرمایا ہے۔[2] ان

۱۔ ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، جلد ۳: ۲۲۰

۲۔ سنن ابی داود، حدیث ۳۴۲۸

ارشادات سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اسلام نے خواتین کی اسمگلنگ اور جنسی استحصال کو ممنوع قرار دیا ہے۔

اسلامی قانون کے نقطہ نظر سے جنسی استحصال کے لیے خواتین کی اسمگلنگ کو تین طریقوں سے روکا جاسکتا ہے: اولاً روک تھام اور تدارک کے ذریعے، ثانیاً نفاذ بذریعہ استغاثہ، ثالثاً تحفظ کے ذریعے۔ شریعت میں خواتین کی اسمگلنگ اور غلامی کو حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی خلاف ورزی قرار دیا گیا ہے۔ یہ عمل دونوں قسم کے حقوق کو پامال کرنے کے مترادف ہے۔ اس لیے کہ اس قبیح عمل کے مرتکبین مقاصد شریعت کی صریح خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اس حوالے حدیث مبارکہ کے الفاظ کچھ یوں ہیں: لا ضرر ولا ضرار[۱]۔ یہ حدیث جو بنیادی قاعدے کی وضاحت کرتی ہے، اس کے مطابق انسانوں بالخصوص خواتین کی اسمگلنگ نہ صرف حفظ نفس بلکہ حفظ عرض کو نقصان پہنچانے کا سبب ہے۔ جس کے لیے حکومت وقت یا مجاز اتھارٹی کو ایسی مجرمانہ کارروائیوں کو روکنے اور مجرموں کو سزائیں دلوانے کے لیے قانون سازی کا اختیار ہے۔

چونکہ زیادہ تر مسلم ممالک نے بین الاقوامی معاہدوں کو تسلیم کیا ہوا ہے اور قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے: ﴿وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولا﴾ [بنی اسرائیل ۱۷:۳۴] (اور عہد کو پورا کرو، ہر عہد کی بابت پرسش ہوگی)۔ ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَبِعَهْدِ اللهِ أَوْفُوا﴾ [الانعام ۶: ۱۵۲] (اللہ کے ہر عہد کو پورا کرو)۔

تفسیر تدبر القرآن میں اس کی تشریح یوں کی گئی ہے کہ اس میں وہ تمام عہد بھی آگئے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے لیے ہیں اور وہ عہد بھی آگئے، جو ہم آپس میں کسی مقصد صالح کے لیے کرتے ہیں۔ حدیث مبارکہ ہے جو عمر بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ بلاشبہہ رسول اللہ نے فرمایا: مسلمان اپنی شرطوں پر ہیں سوائے اس شرط کے جو حلال کو حرام یا حرام کو حلال

۱۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الأحکام، باب من بنی فی حقہ مایضر بجارہ، حدیث: ۲۳۴۰

ٹھہرائے۔[1] حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: حقوق کے حصے شرطوں کے مطابق ہیں اور تیرے لیے وہی ہے جس کی تو نے شرط عائد کی۔[2]

اس سے یہ بات واضح ہے کہ مسلم ممالک نے جنسی تشدد اور استحصال سے متعلق جو بین الاقوامی معاہدات کی توثیق کی ہے، ان کے نفاذ کے حوالے سے تمام تدابیر اختیار کرنا ان پر لازم ہے۔

جنسی بے راہ روی اور تشدد سے حفاظتی اقدامات کے طور پر قرآن مجید میں جو دیگر احکامات ذکر ہوئے ہیں ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

- غیر محرم مردوں اور رشتہ داروں کے درمیان فرق قائم کیا گیا اور یہ حکم دیا گیا کہ صرف محرم رشتہ دار ہی آزادی کے ساتھ آپ کے گھروں میں آجاسکتے ہیں۔
- تمام مسلمان عورتوں کو حکم دیا گیا کہ جب وہ باہر نکلیں تو خود کو چادروں سے اچھی طرح ڈھانک کر اور گھونگٹ ڈال کر نکلا کریں۔
- زنا کو معاشرتی جرم کے ساتھ ساتھ فوجداری جرم قرار دیا گیا اور اس کے لیے سخت سزا مقرر کی گئی ہے۔
- بدکار مردوں اور عورتوں سے معاشرتی مقاطعہ کا حکم دیا گیا اور ان کے ساتھ رشتہ مناکحت جوڑنے سے اہل ایمان کو منع کر دیا گیا۔
- جو لوگ بے ہودہ خبریں اور بری افواہیں پھیلائیں اور مسلم معاشرے میں فحش اور فواحش کو رواج دینے کی کوشش کریں، ان کے متعلق بتایا گیا کہ وہ ہمت افزائی کے نہیں بلکہ سزا کے مستحق ہیں۔

۱۔ سنن ترمذی حدیث ۱۳۵۳

۲۔ صحیح بخاری ۲: ۹۶۹

- لوگوں کو عام ہدایت کی گئی کہ ایک دوسرے کے گھروں میں بے تکلف نہ گھس جایا کریں بلکہ اجازت لے کر جایا کریں۔
- مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی غض بصر کا حکم دیا گیا اور ایک دوسرے کو گھورنے یا تاک جھانک کرنے سے منع کر دیا گیا۔
- عورتوں کو حکم دیا گیا کہ اپنے گھروں میں سر اور سینہ ڈھانک کر رکھیں۔
- گھریلو معاشرت میں خانگی ملازموں اور نابالغ بچوں کے لیے یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ وہ خلوت کے اوقات میں کسی مرد یا عورت کے کمرے میں اچانک نہ گھس جایا کریں۔ اولاد تک کو اجازت لے کر آنے کی عادت ڈالی جائے۔
- معاشرے میں عورتوں اور مردوں کے بن بیاہے بیٹھے رہنے کا طریقہ ناپسندیدہ قرار دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ غیر شادی شدہ لوگوں کے نکاح کیے جائیں۔ اس لیے کہ تجرد فحش آفریں بھی ہوتا ہے اور فحش پذیر بھی۔[1]

ان احکامات کو کس طرح روبعمل لایا جائے اس حوالے سے بالخصوص ایک اسلامی ریاست میں درج ذیل پہلوؤں سے کام کیا جاسکتا ہے:

جنسی تشدد فوجداری قانون میں

حالت جنگ میں جنسی تشدد اپنے وسیع تر معنی میں فساد فی الارض کی شکل ہے، جس کی اسلام نے شدت سے مذمت کی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے: ﴿وَإِذَا تَوَلَّى سَعَى فِي الأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللهُ لا يُحِبُّ الْفَسَادَ﴾ [البقرۃ۲: ۲۰۵] (جب اسے غلبہ حاصل ہوتا ہے تو اس کی ساری دوڑ دھوپ اسے لیے ہوتی ہے کہ زمیں میں فساد پھیلائے، کھیتوں کو غارت کرے اور نسل انسانی کو تباہ کرے، حالانکہ اللہ فساد ہرگز پسند نہیں کرتا)۔

۱۔ ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن ۳: ۱۴۵

کئی اہل علم کے نزدیک جنسی تشدد اور زنا بالجبر حرابہ اور فساد فی الارض کی شکل ہے۔ ان علما کے نزدیک لفظ "حرابہ" کا اطلاق محض مسلح ڈکیتی یا راہزنی پر نہیں ہوتا، بلکہ اس میں مسلح بغاوت، اغوا اور اجتماعی زنا بالجبر جیسے افعال بھی شامل ہیں۔

"حرابہ" کے حوالے سے قرآن میں ارشاد ہے: ﴿إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الأَرْضِ ذَلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ [المائدۃ۵: ۳۳] (جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں تگ و دو اس لیے کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں تو ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں یا سولی پر چڑھا دیے جائیں یا وہ جلاوطن کر دیے جائیں۔ یہ ذلت و رسوائی تو ان کے لیے دنیا میں ہے اور آخرت میں ان کے لیے اس سے بڑی سزا ہے)۔

مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> رجم یعنی سنگسار کرنا بھی ہمارے نزدیک تقتیل کے تحت داخل ہے۔ اس وجہ سے وہ غنڈے اور بدمعاش جو شریفوں کی عزت و ناموس کے لیے خطرہ بن جائیں، جو اغوا اور زنا کو پیشہ بنالیں، جو دن دہاڑے لوگوں کی عزت و آبرو پر ڈاکے ڈالیں اور کھلم کھلا زنا بالجبر کے مرتکب ہوں ان کے لیے رجم کی سزا اس لفظ کے مفہوم میں داخل ہے۔[1]

وفاقی شرعی عدالت نے رشیدہ پٹیل کیس میں زنا بالجبر (جنسی تشدد) کو حرابہ قرار دیا ہے اور سوال اٹھایا: کسی کے مال پر ہاتھ ڈالنا اگر محاربے کی تعریف میں شامل ہے تو کسی کی عزت لوٹ لینا اس میں کیوں شامل نہیں ہو سکتا؟ آخر ایک انسان کے پاس عزت و عفت سے بڑا سرمایہ کیا ہو سکتا ہے اور یوں کسی کی عصمت دری کرنے سے زیادہ فساد اور کیا ہو سکتا ہے؟

۱۔ امین احسن اصلاحی، تدبر القرآن (لاہور: فاران فاونڈیشن، ۱۹۸۸) ۲: ۵۰۶

تاہم یہاں یہ اشکال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر زنا بالجبر کو زنا کی حد سے نکال کر حرابہ میں شامل کر بھی دیا جائے تو جرم کے لحاظ سے اس کی نوعیت میں کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا؛ اس لیے کہ حرابہ کا شمار بھی حدود جرائم میں ہوتا ہے جس کے لیے خاص نصاب اور عدالتی طریقہ کار کو اپنانا ضروری ہوگا۔

اس کے برعکس متعدد اہل علم کی رائے میں جنسی تشدد کی صرف چند مخصوص صورتوں ہی حدود جرائم میں آتی ہیں۔ البتہ ریاست سیاستِ شرعیہ کے تحت حاصل شدہ اختیار کو بروئے کار لاتے ہوئے جنسی تشدد کی ایسی تمام صورتوں کو جو حدود کے تحت نہیں آتیں ان کو جرائم قرار دے سکتی ہے اور ان کے لیے مناسب سزائیں تجویز کر سکتی ہے۔ مزید ریاست کے پاس یہ بھی اختیار ہے کہ وہ اس سلسلے میں جرم کے اثبات کے لیے جو طریقہ مناسب سمجھے تجویز کر سکتی ہے۔

مسلح تصادم کے دوران جنسی تشدد کے حوالے سے خصوصی احکام

اس حوالے سے سب سے اہم بات رسول اللہ ﷺ کا اسوہ حسنہ اور سیرت مبارکہ ہے کہ آپ ﷺ جب بھی کسی لشکر کو روانہ کرتے تو اسی خصوصی ہدایات فرماتے جو کہ اسلام کے آداب القتال کے باب میں بنیادی اصولوں کا درجہ رکھتی ہیں اور معروف و معلوم ہیں۔

فقہا نے وضاحت کی ہے کہ جنسی تشدد صرف عورتوں تک محدود نہیں، بلکہ کہ مرد اور بچے بھی اس کا نشانہ بن سکتے ہیں۔[1]

اسلامی شریعت میں بعض امور ایسے ہیں جو عام حالات میں حرام ہونے کے باوجود اضطرار کی حالت میں جائز ہو جاتے ہیں۔ لیکن فقہائے اسلام نے اس بات کو صراحت سے بیان کر دیا ہے کہ جنسی تشدد ان امور میں شامل نہیں۔ اس لیے جنسی جرائم کا ارتکاب چاہے حالت جنگ ہو یا حالت امن ہر دو صورتوں میں ناجائز ہے۔ اور اضطرار کا سہارا لے کر اس فعل شنیع کے ارتکاب کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔[2]

۱۔ مبسوط، کتاب الحدود ۹: ۶۷۰

۲۔ جصاص، احکام القرآن ۳: ۲۸۵

معاملہ بالمثل کے تحت بھی اسلام میں کسی بھی حرام فعل کو کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ یعنی اگر کفار مسلمانوں کی عورتوں کے ساتھ کسی بھی قسم کی جنسی زیادتی کے مرتکب ہوتے ہیں تب بھی مسلمان فوجیوں کو بدلے میں کفار کی عورتوں یا مردوں کو اس قسم کے فعل شنیع کا نشانہ بنانا درست نہیں۔[1]

عام حالات میں پابندیِ عہد کا اس قدر سختی کے ساتھ اسلام مطالبہ کرتا ہے، ظاہر ہے کہ جنگ کی حالت میں اس کی اہمیت مزید دوچند ہو جاتی ہے، اس لیے خصوصاً دورانِ جنگ یہ تاکید کی گئی ہے کہ دشمن خواہ بدعہدی کیوں نہ کرے، مسلمانوں کے لیے ہرگز یہ اجازت نہیں کہ قبل از اطلاع ان کی جانب پیش قدمی کریں یا بغیر انقطاعِ عہد کی اطلاع کے ان پر چڑھ دوڑیں؛ بلکہ ان کی جانب سے عہد شکنی کے باوجود بھی مسلمانوں کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ پہلے صاف اور صریح الفاظ میں معاہدہ کے خاتمہ کا اعلان کر دیں، پھر اس کے بعد ہی وہ جنگی کارروائی کر سکتے ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے: اور اگر تجھ کو ڈر ہو کسی قسم کے دغا کا تو پھینک دے ان کا عہد ان کی طرف ایسی طرح پر کہ ہو جاؤ تم اور وہ برابر، بیشک اللہ کو خوش نہیں آتے دغاباز۔ (الانفال:۵۸) اس آیت کریمہ میں قانون کی ایک اہم دفعہ بتلائی گئی ہے جس میں معاہدہ کی پابندی کی خاص اہمیت کے ساتھ یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ اگر کسی وقت معاہدہ کے دوسرے فریق کی طرف سے خیانت یعنی عہد شکنی کا خطرہ پیدا ہو جائے تو یہ ضروری نہیں کہ ہم معاہدہ کی پابندی کو بدستور قائم رکھیں؛ لیکن یہ بھی جائز نہیں کہ معاہدہ کو صاف طور پر ختم کر دینے سے پہلے ہم ان کے خلاف کوئی اقدام کریں، بلکہ صحیح صورت یہ ہے کہ ان کو اطمینان و فرصت کی حالت میں اس سے آگاہ کر دیا جائے کہ تمہاری بدنیتی یا خلاف ورزی ہم پر ظاہر ہو چکی ہے، یا یہ کہ تمہارے معاملات مشتبہ نظر آتے ہیں؛ اس لیے ہم آئندہ اس معاہدہ کے پابند نہیں رہیں گے، تم کو بھی ہر طرح اختیار ہے کہ ہمارے خلاف جو کارروائی چاہو کرو!

۱۔ السیر الکبیر ۱: ۲۱۴

اس سلسلہ کا ایک دلچسپ اور مشہور واقعہ جس کا ذکر مفتی محمد شفیع صاحب نے کیا ہے: حضرت معاویہؓ کا ایک قوم کے ساتھ ایک میعاد کے لیے التوائے جنگ کا معاہدہ تھا، حضرت معاویہ نے ارادہ فرمایا کہ اس معاہدہ کے ایام میں اپنا لشکر اور سامان جنگ اس قوم کے قریب پہنچا دیں، تاکہ معاہدہ کی میعاد ختم ہوتے ہی وہ دشمن پر ٹوٹ پڑیں، مگر عین اس وقت جب حضرت معاویہ کا لشکر اس طرف روانہ ہو رہا تھا، یہ دیکھا گیا کہ ایک معمر آدمی گھوڑے پر سوار بڑے زور سے یہ نعرہ لگا رہا ہے: اللہ اکبر، اللہ اکبر وفاء لا غدرًا، یعنی نعرۂ تکبیر کے ساتھ یہ کہا کہ ہم کو معاہدہ پورا کرنا چاہیے، اس کی خلاف ورزی نہ کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس قوم سے کوئی صلح یا ترکِ جنگ کا معاہدہ ہو جائے تو چاہیے کہ ان کے خلاف نہ کوئی گرہ کھولیں اور نہ باندھیں۔ حضرت معاویہؓ کو اس کی خبر کی گئی، دیکھا تو یہ کہنے والے بزرگ حضرت عمرو بن عنبسہؓ صحابی تھے۔ حضرت معاویہؓ نے فوراً اپنی فوج کو واپسی کا حکم دے دیا، تاکہ التوائے جنگ کی میعاد میں لشکر کشی پر اقدام کر کے خیانت میں داخل نہ ہو جائیں۔[1]

جنسی تشدد سے روک تھام کے لیے اسلام میں جہاں عمومی ہدایات دی گئی ہیں وہاں دوران جنگ اور مسلح تصادم کے دوران اس حوالے سے خصوصی ہدایات بھی ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر جنگ خیبر کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے واضح طور پر جنسی تشدد کے حوالے سے ہدایات دیں اور اس بات سے منع فرمایا کہ دوران جنگ دشمن کی عورتوں سے کسی قسم کا جنسی تعلق قائم کیا جائے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے پانی سے غیر کی کھیتی کو سیراب کرے"۔ اسی طرح آداب القتال کے حوالے سے جو تعلیمات رسول اللہ ﷺ اور حضرات خلفائے راشدینؓ سے منقول ہیں ان میں یہ بات شامل ہے کہ دوران جنگ عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور ضعیفوں کو کسی قسم کے تشدد کا نشانہ نہ بنایا جائے۔

۱۔ معارف القرآن ۴: ۲۷۰

نتائج وسفارشات

اسلام میں جنسی تشدد کی روک تھام کے لیے جو احتیاطی اقدامات دیے گئے ہیں ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

- اسلامی معاشرے کی بنیاد تکریمِ انسانی کے اصول پر ہے جہاں عزت انسانی کو تقدس اور احترام حاصل ہے۔ اور ہر ایسا فعل ممنوع و حرام قرار پاتا ہے جس سے عزت انسانی پر حرف آتا ہو۔ اس حوالے سے مسلم اور غیر مسلم میں کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے: ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ﴾ کہ ہم نے بنی آدم کو عزت و تکریم دی۔
- معاشرے میں ہر ایسے فعل کا سدِباب کیا گیا ہے جو غیر اخلاقی یا بے حیائی کا وسیلہ بنتا ہو۔ چنانچہ مردوں کو نگاہیں نیچے رکھنے اور عورتوں کو پردے کا حکم دیا گیا۔ نکاح کی ترغیب دلائی گئی، فحش اور فواحش پھیلانے سے روکا گیا۔ بدکار مردوں اور عورتوں کے معاشی مقاطعہ کا حکم دیا گیا۔
- اسلام ایک ایسے معاشرے کا خواہاں ہے جہاں نوجوانوں کی توانائیاں مثبت اور صحت مندانہ کاموں میں صرف ہوں۔ وہ اخلاقی اقدار کے حامل ہوں۔ جہاں معاشرے کے اہم افراد اس بات کو یقینی بنائیں کہ نوجوان نسل غیر صحت مندانہ کاموں میں حصہ نہ لیں یا اجتناب کریں۔
- جنسی تشدد کی روک تھام کے لیے اسلامی احکام کی تعمیل جس طرح ایک مسلم معاشرے یا اسلامی ریاست میں ضروری ہے اسی طرح حالت جنگ یا مسلح تصادم کے دوران ان پر عمل پیرا ہونا لازم ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر اسلامی احکام جگہ، وقت یا اشخاص کے تبدیل ہونے سے تبدیل نہیں ہوتے۔

- اس حوالے سے ذرائع ابلاغ کے کردار کو کسی طور پر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، ذرائع ابلاغ چاہے روایتی ہوں یا غیر روایتی جیسے سماجی رابطوں کے لیے متعارف ذرائع، انسانی سوچ اور فکر کی تعمیر میں کلیدی کردار رکھتے ہیں؛ اس لیے ذرائع ابلاغ کو بھرپور انداز میں بروئے کار لانے کی ضرورت ہے تاکہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات کو عام کیا جاسکے۔

جنسی تشدد: کلاسیکی اور جدید فقہی اجتہادات کے تناظر میں

ڈاکٹر محمد طاہر منصوری*

جنسی تشدد یا جنسی زیادتی (Sexual violence) اس عہد کا ایک انتہائی سنگین انسانی مسئلہ ہے، جس نے تکریم انسانیت، انسانی شرف و آبرو، حریت انسان جیسی مسلمہ انسانی اور اسلامی اقدار کو شدت کے ساتھ مجروح کیا ہے۔ گزشتہ چند دہائیوں میں کئی ممالک میں مسلح تنازعات کے دوران کمزور اور بے بس خواتین کی بزور قوت عصمت دری کے متعدد واقعات سامنے آئے ہیں۔ جنگ زدہ علاقوں میں اس طرح کا تشدد عام طور پر طاقتور اور فاتح فوج کی جنگی حکمت عملی کا حصہ ہوتا ہے۔ جنسی تشدد کو جنگ کے ایک تباہ کن ہتھیار اور جنگی حکمت عملی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد جنسی خواہشات پورا کرنے سے زیادہ محکوم اور زیر دست افراد کی اہانت و تذلیل ہوتا ہے، اور طاقتور گروہ کی سطوت و جبروت اور اس کی دہشت کو لوگوں کے دلوں میں بٹھانا ہوتا ہے۔

مسلح تنازعات میں جنسی تشدد گزشتہ کچھ عرصے سے بین الاقوامی انسانی قانون کے مطالعے کا ایک خصوصی موضوع بن چکا ہے۔ یہ بات وضاحت کی محتاج نہیں کہ بین الاقوامی قانون ہر طرح کے جنسی تشدد کو قابل سزا جرم قرار دیتا ہے۔ انٹرنیشنل ریڈ کراس کمیٹی (ICRC) جنسی تشدد کے متاثرین کو مطلوبہ تحفظ اور مدد فراہم کرنے کے حوالے سے موثر کردار ادا کر رہی ہے۔ جنسی تشدد کے شکار افراد خاص طور پر خواتین اور بچوں کو اس صورت حال سے نکالنا، انہیں تحفظ فراہم کرنا اور ان کی متنوع طبی، مالی اور قانونی ضروریات کو پورا کرنا اس کے خصوصی لائحہ عمل اور پروگرام کا حصہ ہے۔

جنسی تشدد اور جنسی زیادتی سے مراد جنگ میں باندیاں بنانا اور ان سے جبری جنسی تعلق، جبری قحبہ گری (Prostitution) عورت کو جبراً حمل پر مجبور کرنا، بیوی سے اس کی رضامندی

---

* سابق نائب صدر، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

کے بغیر مجامعت یا جنسی تعلق (marital rape)، بچوں سے بد فعلی اور انسانی تجارت جیسے امور ہیں۔

کتاب کے اس باب میں جنسی تشدد سے تعلق رکھنے والے چند منتخب مسائل کا شرعی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے۔ جدید فقہی فکر میں ان مسائل کا مطالعہ جس طرح کیا گیا ہے، اسے خاص طور پر اس باب میں زیر بحث لایا گیا ہے۔

اس باب میں درج ذیل چار موضوعات پر گفتگو کی جائے گی:

۱۔ جنسی تشدد کا مفہوم اور اس کی شکلیں

۲۔ مسلح تنازعات میں جنسی تشدد: شریعت کے تناظر میں

۳۔ غلاموں اور باندیوں کا نظام: کلاسیکی اور جدید فقہی مباحث

۴۔ بیوی کے ساتھ بلا رضا مجامعت (marital rape) اور اسلامی نقطۂ نظر

مبحث اول: جنسی تشدد کا مفہوم اور اس کی صورتیں

مسلح تصادم اور تنازعات کے تناظر میں جنسی تشدد میں وہ تمام جنسی افعال شامل ہیں جو کمزور و بے بس خواتین، بچوں اور مردوں کے خلاف روا رکھے جاتے ہیں۔ پناہ گزین کیمپوں میں محصور افراد خاص طور پر اس طرح کے افعال کا نشانہ بنتے ہیں۔ مسلح تنازعات میں واقع ہونے والا جنسی تشدد صرف جنسی افعال تک ہی محدود نہیں رہتا، بلکہ بہت سے دیگر افعال بھی اس کا حصہ ہوتے ہیں۔ ان میں قتل عام، املاک کی تباہی، بچوں اور عورتوں کا اغوا، بردہ فروشی، جبری قحبہ گری، جبری شادیاں جیسی کارروائیاں شامل ہیں۔

حالت امن میں واقع ہونے والے جنسی تشدد کو عام طور پر زنا بالجبر کے مترادف سمجھا جاتا ہے، جہاں ایک فرد قوت و طاقت کے بل بوتے پر عورت کے ساتھ اس کی رضامندی کے بغیر جنسی تعلق قائم کرتا ہے۔ بین الاقوامی حقوق انسانی کے تصورات میں یہ بات اہم نہیں ہے کہ جس عورت کے ساتھ جبراً جنسی تعلق قائم کیا جا رہا ہے، وہ اس کی منکوحہ ہے یا کوئی اجنبی عورت ہے۔

ایک شوہر کا اپنی بیوی سے اس کی مرضی کے بغیر جنسی تعلق "ازدواجی عصمت دری" (marital rape) ہے۔[۱]

تاہم یہ بات ذہن میں رہے کہ جنسی تشدد اور جنسی زیادتی کا عمل بالغ افراد، بچوں، عورتوں اور مردوں اور ہر قسم کے کمزور و بے بس لوگوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔

بین الاقوامی قانون اور حقوق انسانی کے معاہدات و مواثیق اور انسانی حقوق کے تصورات (modern notions of human rights) کی رو سے جنسی تشدد میں جنسی زیادتی سے تعلق رکھنے والا ہر فعل شامل ہے چاہے عملاً جنسی فعل کا ارتکاب نہ بھی ہو۔ عورتوں کو جنسی طور پر ہراساں کرنا، انہیں برہنا کرنا، برہنگی کی تصاویر یا فلمیں بنانا اور ان کی تشہیر کرنا، گھریلو تشدد (domestic violence) یعنی شوہروں کا بیویوں پر جسمانی تشدد، عورت کی جبری شادی، جبری حمل، عورتوں کی جبری نس بندی وغیرہ، بچوں کا جنسی استحصال، جنس نگاری (پورنوگرافی) کو دیکھنے یا اس میں حصہ لینے پر مجبور کرنا یہ سب جنسی تشدد کا حصہ ہیں۔

تاہم عورت کے ساتھ جبری جنسی فعل جنسی تشدد کی سب سے معروف اور نمایاں شکل ہے۔ ماضی میں کونگو، مالی، بوسنیا، جنوبی سوڈان اور شام میں جنسی تشدد کے بے شمار واقعات رونما ہوئے ہیں۔ اقوام متحدہ کے اداروں اور حقوق انسانی کی تنظیموں، ایمنسٹی انٹرنیشنل وغیرہ کی رپورٹس کے مطابق نوّے کی دہائی میں بوسنیا میں ۵۰ ہزار خواتین اجتماعی جنسی زیادتی کا نشانہ بنیں۔ ہزاروں عورتوں کو جیلوں میں ڈال کر ان پر غیر انسانی تشدد کیا گیا، ان کے نازک اعضا کی قطع و برید کی گئی۔ روانڈا میں ۱۹۹۴ء کے قتل عام کے دوران ۵ لاکھ سے زائد عورتوں کی اجتماعی آبرو ریزی کی گئی۔ (ایمنسٹی انٹرنیشنل رپورٹ، ۲۰۰۶ء) عراق میں قابض فوج نے ہزاروں عورتوں

۱۔ دیکھیے: ڈاکٹر الفت الدبجی، العنف ضد المرأة... الأبصار والتدابير، مطبوعه: المنتدى العالمي للوسطية: قضايا المرأة في المجتمعات الإسلامية وتحديات العصر، جولائی ۲۰۰۹ء، ص ۳۰۰

کو تشدد کا نشانہ بنایا۔ ابو غریب جیل میں جس طریقے سے ان کے ساتھ غیر انسانی سلوک ہوا اور ان کی عصمت دری کی گئی، وہ انسانیت کے چہرے کا ایک بد نما داغ ہے۔

ابو غریب جیل سے رہا ہونے والی سینکڑوں خواتین نے ذلت اور بدنامی کے داغ کو مٹانے کے لیے خودکشیاں کیں۔

بوسنیا کی جنگ کو ختم ہوئے ۲۵ سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے، تاہم اب تک جنسی تشدد کا شکار عورتیں، نفسیاتی اور ذہنی کرب سے باہر نہیں نکل پائی ہیں۔ اور متعدد نفسیاتی امراض میں مبتلا ہیں۔[1]

مبحث دوم: جنسی تشدد اور اسلام کا موقف

جنسی تشدد اور انسان پر تشدد کی دیگر تمام شکلیں اسلامی تعلیمات کے منافی ہیں۔ اسلام انسانی شرف و آبرو کے تحفظ اور تکریم انسانیت پر زور دیتا ہے، اور اس کے منافی ہر عمل کو حرام قرار دیتا ہے۔ کسی انسان کو بلاجواز اور بغیر کسی شرعی سبب کے، نقصان اور ضرر پہنچانا شریعت کی نگاہ میں گناہ ہے اور قابل تعزیر جرم ہے۔ زمین پر فساد پھیلانا، املاک کو نقصان پہنچانا، عورتوں کی آبرو ریزی، مفتوحہ قوم کی عورتوں اور بچوں کو اغوا کرنا، مغوی عورتوں کو جسم فروشی کے لیے استعمال کرنا جیسے افعال دہشت گردی اور فساد فی الارض کے زمرے میں آتے ہیں جو اسلام کی نگاہ میں ایک سنگین جرم ہے۔ مسلح تنازعات میں بے بس عورتوں کی عصمت دری فساد فی الارض اور حرابہ کی ایک شکل ہے، کیونکہ یہ تشدد کے بہت سے دیگر افعال کا حصہ ہوتی ہے۔

ذیل میں جنسی تشدد اور دیگر حالتوں کے حوالے سے اسلامی تعلیمات بیان کی جاتی ہیں۔

1 - Tamara Banjegrav, Gender, Nation, Rape: Intersections of gender and ethics violence during the war in Bosnia and Herzegovina, submitted to nationalism standes centre European University. Budapest Hungary, 2009

ا۔ انسانی شرف و آبرو کا تحفظ

انسانی شرف و آبرو اور تکریم انسانیت کا تحفظ شریعت کا اہم مقصد ہے۔ اسلام کی نگاہ میں تکریم انسانیت میں سب برابر ہیں۔ ہر فرد انسان ہونے کے ناتے قابل احترام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلا﴾ [بنی اسرائیل ۱۷: ۷۰] (ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انہیں خشکی و تری میں سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی)۔

مزید فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ﴾ [الحجرات ۴۹: ۱۳] (لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے)۔

نیز فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لا يَسْخَرْ قَومٌ مِنْ قَوْمٍ عَسَى أَنْ يَكُونُوا خَيْرًا مِنْهُمْ وَلا نِسَاءٌ مِنْ نِسَاءٍ عَسَى أَنْ يَكُنَّ خَيْرًا مِنْهُنَّ وَلا تَلْمِزُوا أَنْفُسَكُمْ وَلا تَنَابَزُوا بِالأَلْقَابِ بِئْسَ الاسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الإِيمَانِ وَمَنْ لَمْ يَتُبْ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ [الحجرات ۴۹: ۱۱] (لوگو جو ایمان لائے ہو! نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں کہ ہوسکتا ہے وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو اور جس نے توبہ نہ کی تو وہ ظالموں میں سے ہیں)۔

تکریمِ انسانیت اور عزت و شرف میں انسانوں کی برابری اسلامی تہذیب و تمدن کا ایک درخشاں وصف ہے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کی اس بات پر سخت سرزنش کی تھی کہ ان کے بیٹے نے گھڑ دوڑ میں اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے ایک قبطی کو مارا پیٹا اور کہا کہ وہ (یعنی ابن عمرو بن العاصؓ) ابن الأکرمین یعنی اشراف کا بیٹا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس موقع پر فرمایا: متی استعبدتم الناس وقد ولدتهم أمهاتهم أحرارًا[1] (تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنانا شروع کر دیا ہے جب کہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا ہے!)۔

انسانی عزت و آبرو کا تحفظ شریعت کی نگاہ میں اتنا اہم ہے کہ اس نے پاک دامن عورتوں پر تہمت پر حدِ قذف متعین کی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً وَلا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا وَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ [النور ۲۴: ۴] (اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں اور پھر چار گواہ نہیں لاتے تو انہیں اسّی درّے مارو اور کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو، اور وہی لوگ نافرمان ہیں)۔

اسلامی تعلیمات میں عورت کی تکریم کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اسلام عورت کو جنسی شہوت کا سامان بنانے کو ایک قبیح فعل تصور کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِتَبْتَغُوا عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَنْ يُكْرِهُّنَّ فَإِنَّ اللهَ مِنْ بَعْدِ إِكْرَاهِهِنَّ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ [النور ۲۴: ۳۳] (اور اپنی لونڈیوں کو اپنے دنیوی فائدوں کی خاطر قحبہ گری پر مجبور نہ کرو جبکہ وہ خود پاک دامن رہنا چاہتی ہوں، اور جو کوئی ان کو مجبور کرے تو اس جبر کے بعد اللہ ان کے لیے غفور و رحیم ہے)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مالک جبر کر کے اس سے پیشہ کرائے تو وہ اس کا ذمہ دار ہو گا اور وہی پکڑا جائے گا۔

۱۔ أخرجها ابن عبد الحكم في "فتوح مصر و أخبارها" صـ 290، وأوردها محمد بن يوسف الكاندهلوي في "حياة الصحابة" (2 / 88) باب: عدل النبي صلى الله عليه وسلم وأصحابه.

قرآن و سنت کی مذکورہ نصوص سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ تکریمِ انسانیت اور خاص طور پر عورت کی تکریم شریعت کی ترجیحات میں شامل ہے۔ اور ہر وہ فعل جو تکریمِ انسانیت کے منافی ہے، وہ سنگین معاشرتی گناہ اور جرم ہے۔

۲۔ عدل وانصاف کی تاکید

تکریم انسانی کا لازمی تقاضا ہے کہ ہر فرد اور قوم کے ساتھ عدل کا معاملہ کیا جائے۔ حالت جنگ اور مسلح تنازعات میں دشمن یا مفتوحہ قوم کے ساتھ عدل کا معاملہ عام حالات کے مقابلے میں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ قرآن کریم میں سختی سے تاکید کی گئی ہے کہ دشمن اور حریف قوم کے ساتھ بھی عدل کیا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لله شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى وَاتَّقُوا اللهَ إِنَّ اللهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ﴾ [المائدۃ۵: ۸] (اے ایمان والو! اللہ کے لیے انصاف کی گواہی دینے کے لیے کھڑے ہو جایا کرو۔ اور کچھ لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ انصاف نہ کرو۔ انصاف کیا کرو کہ یہی پرہیز گاری کی بات ہے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ کچھ شک نہیں کہ اللہ تمہارے سب اعمال سے خبر دار ہے)۔

یہ غلط فہمی دور کرنے کے لیے کہ دشمن کے ساتھ عدل کا حکم صرف اس صورت میں ہے جب دو دشمنوں کے درمیان تنازعے کا فیصلہ کرنا ہو، قرآن کریم نے صراحت کی کہ عدل واجب ہے خواہ اس کے نتیجے میں مومن کو اپنے والدین یا قریبی لوگوں کے خلاف دشمن کے حق میں فیصلہ کرنا پڑے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لله وَلَوْ عَلَى أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالأَقْرَبِينَ إِنْ يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللهُ أَوْلَى بِهِمَا فَلا تَتَّبِعُوا الْهَوَى أَنْ تَعْدِلُوا وَإِنْ تَلْوُوا أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا﴾ [النساء۴: ۱۳۵] (اے ایمان والو! انصاف پر قائم رہو اور اللہ کے لیے سچی گواہی دو، خواہ یہ تمہارے اپنے خلاف یا تمہارے ماں باپ یا رشتہ داروں کے خلاف ہی ہو۔ اگر کوئی امیر ہے یا فقیر تو اللہ ان دونوں کا زیادہ

خیر خواہ ہے۔ پس تم خواہشِ نفس کے پیچھے چل کر عدل کو نہ چھوڑ دینا۔ اگر تم لگی لپٹی بات کہو گے یا سچائی سے پہلو تہی کرو گے تو جان رکھو اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں سے واقف ہے)۔

۳۔ انسانی جان کا تقدس

انسانی جان کے تقدس اور اس کی حفاظت کی اہمیت کو قرآن و سنت میں متعدد مقامات پر اجاگر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿مِنْ أَجْلِ ذَلِكَ كَتَبْنَا عَلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنَّهُ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا﴾ [المائدۃ۵: ۳۲] (اسی سبب سے، ہم نے بنی اسرائیل پر لکھا کہ جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے کے بغیر یا زمین میں فساد [روکنے] کے علاوہ قتل کیا تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا، اور جس نے کسی کو زندگی بخشی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخشی)۔

نیز فرمایا: ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ [البقرۃ۲: ۱۷۹] (اور اے عقل مندو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے تاکہ تم [خونریزی سے] بچو)۔

ارشاد فرمایا: ﴿وَلا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللهُ إِلا بِالْحَقِّ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا فَلا يُسْرِفْ فِي الْقَتْلِ إِنَّهُ كَانَ مَنْصُورًا﴾ [الاسراء۱۷: ۳۳] (اور جس جان کو قتل کرنا اللہ نے حرام کر دیا ہے اسے ناحق قتل نہ کرنا، اور جو کوئی ظلم سے مارا جائے تو ہم نے اس کے ولی کے واسطے اختیار دے دیا ہے لہٰذا قصاص میں زیادتی نہ کرے، بے شک اس کی مدد کی گئی ہے)۔

رسول اللہ ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا: ألا دماؤكم وأموالكم وأعراضكم حرام عليكم كحرمة يومكم هذا في شهركم هذا في بلدكم هذا[1] (سنو! تمہاری جان، مال،

۱۔ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب قول النبی ﷺ: "رب مبلغ أوعى من سامع"، حدیث ۶۷

آبرو ایک دوسرے کے لیے اسی طرح مقدس اور قابل احترام ہیں جیسے آج کا دن، آج کا مہینہ اور تمہارا یہ شہر)۔

۴۔ فساد فی الأرض کی ممانعت

حالت جنگ میں جنسی تشدد اپنے وسیع تر معنی میں فساد فی الارض کی شکل ہے، جس کی اسلام نے شدت سے مذمت کی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے: ﴿وَإِذَا تَوَلَّى سَعَى فِي الأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللهُ لا يُحِبُّ الْفَسَادَ﴾ [البقرۃ۲: ۲۰۵] (جب اسے غلبہ حاصل ہوتا ہے تو اس کی ساری دوڑ دھوپ اسی لیے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائے، کھیتوں کو غارت کرے اور نسل انسانی کو تباہ کرے، حالانکہ اللہ فساد ہر گز پسند نہیں کرتا)۔

بہت سے علما کے نزدیک جنسی تشدد اور زنا بالجبر حرابہ اور فساد فی الارض کی شکل ہے، قدیم مفسرین میں قرطبی اور معاصرین میں مولانا امین احسن اصلاحی اور ڈاکٹر محمود احمد غازی اس موقف کے حامی ہیں۔ ان علما کے نزدیک لفظ "حرابہ" کا اطلاق محض مسلح ڈکیتی یا راہ زنی پر نہیں ہوتا، بلکہ اس میں مسلح بغاوت، اغوا اور اجتماعی زنا بالجبر جیسے افعال بھی شامل ہیں۔

"حرابہ" کے حوالے سے قرآن میں ارشاد ہے: ﴿إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الأَرْضِ ذَلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ [المائدۃ۵: ۳۳] (جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں تگ و دو اس لیے کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں تو ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں یا سولی پر چڑھا دیے جائیں یا وہ جلاوطن کر دیے جائیں۔ یہ ذلت و رسوائی تو ان کے لیے دنیا میں ہے اور آخرت میں ان کے لیے اس سے بڑی سزا ہے)۔

وفاقی شرعی عدالت نے رشیدہ پٹیل کیس میں زنا بالجبر (جنسی تشدد) کو حرابہ قرار دیا ہے۔ جسٹس فدا محمد خان کے تحریر کردہ فیصلے میں کہا گیا ہے کہ زنا بالجبر (rape) فساد فی الارض اور حرابہ کی ایک شکل ہیں۔

۵۔ ضرر پہنچانے کی ممانعت

قرآن و سنت میں متعدد مقامات پر بلاعذر شرعی کسی انسان کو ضرر پہنچانے کی ممانعت آئی ہے۔ اسلام مردوں کو تلقین کرتا ہے کہ وہ عورتوں پر تشدد نہ کریں۔ نبی اکرم ﷺ نے کبھی اپنی بیویوں پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ قرآن میں جس ضرب کی بات کی گئی ہے، وہ تشدد کی شکل نہیں بلکہ انتہائی شدید حالات میں تادیب کی شکل ہے۔ وہ شدید حالات عورت کی بغاوت، سرتابی، سرکشی اور ادائے حقوق سے اعراض ہیں جسے قرآن "نشوز" سے تعبیر کرتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے مطابق مسواک سے ہلکی ضرب یہ تقاضا پورا کرتی ہے۔ قرآن کی رو سے جسمانی سزا کے اس آخری حربے سے پہلے مرد نصیحت کا وسیلہ اختیار کرے، اگر یہ وسیلہ کارگر نہ ہو تو ترک تعلق کا راستہ اختیار کرے، اگر یہ بھی سودمند نہ ہو تو ہلکی جسمانی سزا کا راستہ اختیار کیا جاسکتا ہے، لیکن یہ بھی اس حد تک ہونا چاہیے جو اصلاح کے لیے ضروری ہو۔ اسلامی قانون میں گھریلو تشدد (domestic violence) پر عورت کو تنسیخ نکاح کا حق دیا گیا ہے۔

قرآنی آیات میں جن مقامات پر مرد کے حق طلاق کا ذکر آیا ہے وہاں مرد کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ اس حق کو عورت کو ضرر پہنچانے کے لیے استعمال نہ کرے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِتَعْتَدُوا وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ وَلا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللهِ هُزُوًا وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهِ وَاتَّقُوا اللهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ [البقرۃ۲: ۲۳۱] (اور جب تم نے عورتوں کو طلاق دے دی ہو اور وہ اپنی عدت کے قریب پہنچ جائیں، تو یا تو ان کو بھلائی کے ساتھ [

اپنی زوجیت میں] روک رکھو، یا انہیں بھلائی کے ساتھ چھوڑ دو، اور انہیں ستانے کی خاطر اس لیے روک کر نہ رکھو کہ ان پر ظلم کر سکو اور جو شخص ایسا کرے گا وہ خود اپنی جان پر ظلم کرے گا، اور اللہ کی آیتوں کو مذاق مت بناؤ اور اللہ نے تم پر جو انعام فرمایا ہے اسے اور تم پر جو کتاب اور حکمت کی باتیں تمہیں نصیحت کرنے کے لیے نازل کی ہیں انہیں یاد رکھو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور جان رکھو کہ اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے)۔

نیز ارشاد ہوا: ﴿وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ ذَلِكَ يُوعَظُ بِهِ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ ذَلِكُمْ أَزْكَى لَكُمْ وَأَطْهَرُ وَاللهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لا تَعْلَمُونَ﴾ [البقرة۲: ۲۳۲] (جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ عدّت پوری کر لیں، تو پھر اس میں مانع نہ ہو کہ وہ اپنے زیر تجویز شوہروں سے نکاح کر لیں، جبکہ وہ معروف طریقے سے باہم مناکحت پر راضی ہوں۔ تمہیں نصیحت کی جاتی ہے کہ ایسی حرکت ہر گز نہ کرنا، اگر تم اللہ اور روز آخر پر ایمان لانے والے ہو تمہارے لیے شائستہ اور پاکیزہ طریقہ یہی ہے کہ اس سے باز رہو۔ اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے)۔

نیز ارشاد ہوا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا وَلا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْتُمُوهُنَّ إِلا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا﴾ [النساء۴: ۱۹] (اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمہارے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن بیٹھو۔ اور نہ یہ حلال ہے کہ انہیں تنگ کر کے اس مہر کا کچھ حصہ اڑا لینے کی کوشش کرو جو تم انہیں دے چکے ہو۔ ہاں اگر وہ کسی صریح بدچلنی کی مرتکب ہوں [تو ضرور تمہیں تنگ کرنے کا حق ہے]۔ ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اسی میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو)۔

اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ جنسی تشدد اور جنسی زیادتی اسلام کی متعدد تعلیمات کے منافی ہیں، جن میں انسانی شرف و آبرو، اور تکریم انسانیت نمایاں ہیں۔

کیا جنسی تشدد کی شکار عورت کے لیے اسقاط حمل جائز ہے؟

بوسنیا، چیچنیا، اریٹریا اور عالم عرب کی جابرانہ حکومتوں کی جیلوں میں عورتوں کے ساتھ زنا بالجبر اور اس کے نتیجے میں حمل کے واقعات کے تناظر میں یہ فقہی مسئلہ بہت شدت سے سامنے آیا کہ کیا ان درندوں کا شکار عورتیں اپنے حمل کو ضائع کر سکتی ہیں؟

اس حوالے سے درج ذیل آرا سامنے آئیں:

۱۔ اسقاط حمل اصولاً ناجائز اور حرام ہے، چاہے وہ زنا کا نتیجہ ہو۔ اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے غامدیہ کو یہ ہدایت کی تھی کہ وہ پیٹ میں پلنے والے بچے کو ولادت اور پھر دودھ چھڑانے تک پالے۔

۲۔ بعض فقہا کے نزدیک حالت اضطرار اور ضرورت شدیدہ کے تحت ابتدائی چالیس دن تک اور بعض کے نزدیک نفخ روح سے پہلے پہلے اسے حمل ضائع کرنے کی بطور رخصت اجازت ہے۔

۳۔ رفع حرج و مشقت شریعت کا ایک مسلمہ اصول ہے جس کے تحت احکام جاری ہوتے ہیں۔ جنگی تنازعات میں انسان نما وحشی درندوں کے ہاتھوں عصمت دری کا شکار ہونے والی یہ عورتیں متعدد ذہنی و نفسیاتی امراض میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ ذلت و بدنامی کے سائے ہر وقت ان کا تعاقب کرتے ہیں۔ خود وہ ناجائز بچہ (war baby) اپنے نسب اور شناخت سے محروم رہتا ہے۔ لہٰذا رفع حرج کے اصول کے تحت اور ایک بڑے ضرر اور بڑے مفسدہ کو دور کرنے کے لیے حمل کو نفخ روح سے پہلے ضائع کرنا جائز ہے۔ ڈاکٹر سعد الدین سعد ہلالی کی رائے میں قاضی یا حکومت کی

اجازت سے اسقاط حمل ہو۔ قاضی اس کی اجازت یہ ثابت ہونے کے بعد دے گا کہ یہ حمل زنا بالجبر کا نتیجہ ہے۔[۱]

فتاوی المجلس الأوروبي للإفتاء والبحوث (فتوی: ۱۳۱ (۲۴/ ۲) میں کہا گیا ہے کہ اگر ایک پاک دامن مسلمان عورت جنسی تشدد اور زنا بالجبر سے حاملہ ہو جاتی ہے تو یہ اس عورت اور اس کے خاندان کے لیے انتہائی پریشانی اور بدنامی کا امر ہے۔ اس کے متاثرہ فرد اور خاندان پر گہرے نفسیاتی اور معاشرتی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس طرح کی عورت کو حمل کے ۱۲۰ دن کے اندر حمل کو ضائع کرنے کی اجازت ہے۔ لیکن اگر ۱۲۰ دن کا عرصہ گزر گیا تو حمل کو ضائع کرنا حرام ہے؛ کیونکہ اس انسانی نفس کا کوئی جرم نہیں کہ اسے قتل کیا جائے۔ اس حالت میں عورت صبر کرے اور اللہ سے اس کا اجر طلب کرے۔[۲]

مبحث سوم: جنسی غلامی (sexual slavery) اور اسلام کا موقف

جدید بین الاقوامی قانون انسانیت اور حقوق انسانی، جنگی قیدیوں کے بارے میں جنیوا کنونشن ہر قسم کی غلامی کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ جنگ کے نتیجے میں عورتوں کو غلام بنانا اور ان سے شہوت رانی جدید حقوق انسانی کے تصورات کے منافی ہے۔ ساری انسانی برادری انسان کی آزادی اور غلامی کی ممانعت کو ایک عالمی مسلمہ اصول کے طور پر تسلیم کرتی ہے۔ اقوام متحدہ کی سطح پر تمام رکن ممالک کے درمیان اس حوالے سے معاہدہ ہو چکا ہے، اس معاہدے کی رو سے یہ تمام ممالک اس کی پاسداری کے پابند ہیں۔

گزشتہ چند برسوں میں غلامی کے بارے میں داعش کے بیانیے نے اس بحث کو ایک دفعہ پھر تازہ کر دیا ہے کہ غلامی کی ممانعت یا جواز کے حوالے سے اسلام کا اصل موقف کیا ہے؟ دولت

۱۔ مجلہ الدراسات الاسلامیۃ، جامعۃ الکویت (bcouncil.kuniu.edu.ku)

۲۔ مزید مطالعے کے لیے دیکھیے: حمد، ایناس عبد اللہ محمد، حکم إجهاض جنين الاغتصاب في الفقه الاسلامي والقانون، مجلۃ الدراسات العلیا، خرطوم جامعۃ النیلین، کلیۃ الدراسات العلیا، مجلہ ۱۴، شمارہ ۵۳، اپریل ۲۰۱۹ء

اسلامیہ (داعش) کے ترجمان جریدے "دابق" میں ایک فتوی "إحياء العبودية إلى قيام الساعة" (قربِ قیامت تک غلامی کے ادارے کی بحالی) کے عنوان سے شائع ہوا۔

اسی رسالے میں ایک اور مضمون شائع ہوا جس کا عنوان تھا: العبودية متجذرة في الإسلام (غلامی کی جڑیں اسلام یعنی قرآن و سنت میں پیوست ہیں)۔ داعش کا بیانیہ یہ ہے کہ غلامی قرآن و سنت سے ثابت ہے، یہ ایک منصوص امر ہے، کوئی انسانی اجتہاد اسے تبدیل نہیں کر سکتا، نہ اس کی نفی کر سکتا ہے۔ اسی فتویٰ کی بنیاد پر داعش نے یزیدی مذہب کی ہزاروں خواتین کو غلام بنایا، منڈیوں میں ان کی خرید و فروخت کی۔ امریکی فوج نے اس حوالے سے تیس ہزار دستاویزات اپنے قبضے میں لی ہیں، جن میں خرید و فروخت کی رسیدیں، عمر کے لحاظ سے عورتوں کی قیمتوں کا نرخ نامہ، جنسی تعلق کے ضوابط وغیرہ شامل ہیں۔

داعش کے فتوی میں یزیدی عورت کو خریدنے والے مالک یا مالکین (اگر وہ مشترکہ ملکیت ہو) کے لیے جنسی تعلقات کے ضوابط و احکام بھی جاری کیے گئے ہیں۔

داعش کے اس بیانیے پر عالم اسلام میں ایک دفعہ پھر یہ بحث چھڑ گئی ہے کہ آیا غلامی کی ممانعت ایک وقتی و عارضی حکم ہے یا یہ ممانعت ابدی ہے۔

زمانہ قدیم میں عربوں اور دیگر اقوام میں یہ رواج تھا کہ وہ جنگی اسیروں کو غلام اور باندیاں بنا لیتے تھے۔ اس دور میں چونکہ اسیران جنگ کے تبادلہ کا طریقہ رائج نہ تھا اور فدیے کا معاملہ کرنا بھی بعض اوقات دشمن سلطنت کے لیے قابل قبول نہ ہوتا تھا، تو اس صورت میں اسلام نے اجازت دی کہ جو کفار جنگ میں گرفتار کیے جائیں، انہیں مسلمان حاکم، بتقاضائے مصلحت غلام اور باندی بنالے۔ تاہم حکومت کو اختیار تھا کہ گرفتار ہونے والے مرد اور عورتوں کو وہ چاہے تو رہا کر دے، دشمن سلطنت سے اس کا فدیہ لے اور چاہے تو ان کا تبادلہ ان مسلمان قیدیوں سے کرے جو دشمن کے قبضے میں ہوں۔ نیز اسے یہ بھی اختیار تھا کہ فوجیوں / مجاہدین میں انہیں بطور مال غنیمت تقسیم کر دے۔ ایک سپاہی اسی عورت سے جنسی تعلق قائم کر سکتا تھا جسے باقاعدہ حکومت نے اس

کی ملکیت میں دیا ہو۔ اس عورت سے تمتع صرف وہی شخص کر سکتا تھا، کسی دوسرے کو اس سے تمتع کی اجازت نہیں تھی۔ شریعت میں اس عورت سے پیدا ہونے والی اولاد اس شخص کی جائز اولاد قرار پاتی ہے۔ اور اس اولاد کے وہی حقوق ہوتے ہیں جو عقد نکاح کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اولاد کے ہوتے ہیں۔ اگر باندی کا مالک وہ باندی کسی اور شخص کے عقد نکاح میں دے دیتا ہے، تو اس کا حق تمتع باقی نہیں رہتا۔ تاہم وہ اس سے باقی خدمات لے سکتا ہے۔[1]

غلامی کے جواز کے حوالے سے بعض علما و مفکرین کی رائے یہ ہے کہ اسلام میں غلام بنانا بطور حکم یا بطور ترغیب نہیں بلکہ مخصوص حالات میں اس کی گنجائش رکھی گئی ہے، جو اجازت کے درجے کی ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو اس بات کی اجازت ہے کہ جب وہ قرین مصلحت سمجھیں تو غلام بنانے کا سلسلہ موقوف رکھیں۔[2]

بعض مفکرین کے نزدیک جنگوں میں غلام بنانے کی اجازت کی شریعت میں حیثیت محض ایک متبادل حل یا آپشن (option) کی ہے جس پر عمل کرنے کے لیے کسی خاص دور کے عالمی اور بین الاقوامی عرف کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ تاہم اگر کسی دور میں یہ عالمی عرف تبدیل ہو گیا اور پہلے کی طرح کے حالات دوبارہ پیدا ہو گئے تو اسلام کا یہ آپشن (option) باقی رہے گا اور اس سلسلے میں قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کے احکام دوبارہ نافذ العمل ہو جائیں گے۔[3]

غلامی کے حوالے سے ایک اور مؤثر موقف یہ ہے کہ اسلام کا مقصود و منتہا غلاموں کی آزادی ہے، نہ کہ انسانوں کو غلام بنانا یا اس غلامی کو باقی رکھنا ہے۔ اسلام نے زمانہ قدیم کے عرف، جنگی قیدیوں کے حوالے سے قوموں کے اجتماعی طرز عمل کے پیش نظر بامر مجبوری غلامی کو قبول کیا۔ اس کا یہ قطعی مطلب نہیں ہے کہ اسلام نے غلام کے متعلق اس عہد کے قوانین اور رواجات کی توثیق کی۔ معروف اسلامی مفکر محمد قطب لکھتے ہیں:

۱۔ دیکھیے: مولانا مودودی، تفہیم القرآن ۱: ۳۴۰

۲۔ دیکھیے: دارالافتاء، جامعۃ العلوم الاسلامیہ، بنوری ٹاؤن کراچی، فتوی: موجودہ دور میں باندیوں اور لونڈیوں کا تصور

۳۔ مولانا زاہد الراشدی، ماہنامہ الشریعۃ، اکتوبر ۲۰۰۴ء

وقتی طور پر اسلام نے اس کے وجود کو برداشت کیا بھی تو محض اس لیے کہ اس کے سامنے اس کے سوا اور کوئی متبادل راہ موجود نہ تھی، کیونکہ اس کے قطعی انسداد کے لیے صرف مسلمانوں کی رضامندی ہی کافی نہ تھی، بلکہ غیر مسلموں کی حمایت اور تعاون بھی ضروری تھا۔ اسلام اس وقت تک غلامی کا قطعی انسداد نہیں کر سکتا تھا جب تک کہ باقی دنیا بھی جنگی قیدیوں کو غلام بنانے سے اجتناب کرنے کا قطعی فیصلہ نہ کر لیتی۔ بعد میں اقوام عالم اس سلسلے میں ایک قطعی اور مشترکہ حل پر رضامند ہو گئیں تو اسلام نے اس کا خیر مقدم کیا، کیونکہ یہ فیصلہ اس کے نظام زیست کے اس بنیادی اور اٹل اصول کا عین منطقی نتیجہ تھا کہ آزادی اور مساوات تمام انسانوں کا بنیادی حق ہے۔[1]

محمد قطب، ممتاز ازہری عالم دین شیخ منصور رجب، معروف اسلامی مفکر و ادیب عباس محمود العقاد اور دیگر کئی معاصر علما و مفکرین کی رائے میں دنیا سے غلامی کا خاتمہ عین اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے۔ اسلام وہ پہلا مذہب ہے جس نے سب سے پہلے غلاموں کی آزادی کا علم بلند کیا۔

اس نقطۂ نظر کے مطابق غلامی کی ممانعت شارع کا مقصود ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آزادی، حریت، مساوات، تکریم انسانی وغیرہ اسلام کے کلیدی اصول اور کلیات (grand principles) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ مقصود شرع ہیں۔ ایک انسانی اجتہاد، فتوی، فقہی استدلال صرف اسی وقت شریعت میں قابل اعتبار ہوتا ہے جب وہ ان کلیدی اصولوں اور کلیات سے ہم آہنگ ہو۔

اگر آزاد انسان کو غلام بنانے کی اجازت ہو، اور اس حکم کی ابدیت پر اصرار ہو تو حریت، انسانی شرف و آبرو جیسی تعلیمات، جو اصل الاصول کی حیثیت رکھتی ہیں، بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔

یہ امر کہ غلامی کی ممانعت مقصود شرع ہے، بہت سی نصوص کے استقرائی مطالعے سے ثابت ہوتا ہے۔

۱۔ محمد قطب، اسلام اور جدید ذہن کے شبہات، اردو ترجمہ، محمد سلیم کیانی، ص ۴۹-۵۰

۱۔ عن أبي هريرة رضي الله عنه أن النبي صلى الله عليه وسلم: قال الله تعالىٰ: ثلاثة أكون خصمهم يوم القيامة، رجل أعطى بي ثم غدر ورجل باع حُرًّا فأكل ثمنه، ورجل استأجر أجيرا فاستوفى منه ولم يعطه أجره.[۱] (ابوہریرہ (رض) نبی (ﷺ) سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کہا: میں قیامت کے دن تین آدمیوں کا دشمن ہوں گا ایک وہ جو میرا نام لے کر عہد کرے پھر توڑ دے، دوسرے وہ شخص جس نے کسی آزاد کو بیچ دیا اور اس کی قیمت کھائی، تیسرے وہ شخص جس نے کسی مزدور کو کام پر لگایا پھر اس سے کام پورا لیا، لیکن اس کی مزدوری نہ دی)۔

اس حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ آزاد انسان کو غلام بنانا پھر اس کو سامان تجارت بنانا، اس کی قیمت وصول کرنا اتنا قبیح اور مکروہ فعل ہے کہ قیامت کے دن ایسے شخص کا حریف اور اس کے خلاف مدعی خود اللہ تعالیٰ کی ذات ہوگی۔

اسلام کی نگاہ میں حریت اور آزادی اصل ہے، قید اور غلامی محض ایک عارضی امر اور استثنائی صورت حال ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کہا تھا: متى استعبدتم الناس وقد ولدتهم أمهاتهم أحرارا (تم نے کب سے انسانوں کو غلام بنانا شروع کر دیا ہے جبکہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا ہے)۔

اس کا مطلب ہے کہ اسلام کی نگاہ میں حریت و آزادی اصل ہے، اور قید و غلامی ایک استثنائی اور عارضی صورت حال ہے۔ مسلم و غیر مسلم تعلقات میں بھی اصل امن ہے، نہ کہ جنگ؛ لہٰذا عارضی صورت حال یعنی جنگ پر مرتب ہونے والے احکام بھی عارضی ہوں گے۔

۱۔ صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب إثم من باع حرا، حدیث ۲۲۲۷

۲۔ قرآن جنگی قیدیوں کو رہا کرنے کی تاکید کرتا ہے: ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً حَتَّى تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا﴾ [محمد ۴۷: ۴] (اس کے بعد تمہیں اختیار ہے، احسان کرو یا فدیہ کا معاملہ کرو تا آنکہ لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے)۔

اس آیت میں قیدیوں کے ساتھ احسان کا معاملہ کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ مولانا مودودی کے بقول: احسان میں چار چیزیں شامل ہیں: ایک یہ کہ قید کی حالت میں ان سے اچھا برتاؤ کیا جائے، دوسرے یہ کہ قتل یا دائمی قید کی بجائے ان کو غلام بنا کر افراد مسلمین کے حوالے کر دیا جائے، تیسرے یہ کہ جزیہ لگا کر ان کو ذمی (یعنی اسلامی حکومت کے شہری) بنالیا جائے اور چوتھے یہ کہ ان کو بلا معاوضہ رہا کر دیا جائے۔ فدیہ کا معاملہ کرنے کی تین صورتیں ہیں: ایک یہ کہ انہیں مالی معاوضہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ رہائی کی شرط پر کوئی خاص خدمت لینے کے بعد چھوڑ دیا جائے، تیسرے یہ کہ اپنے ان آدمیوں سے جو دشمن کی قید میں ہوں، ان کا تبادلہ کر لیا جائے۔[1]

قرآن کی اس آیت سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ اس میں قیدی کی رہائی کا پہلو غالب ہے۔ احسان کی سب سے اعلیٰ شکل یہ ہے کہ قیدی کو بلا کسی فدیے اور معاوضے کے یونہی رہا کر دیا جائے۔

جنگ حنین کے بعد جب قبیلہ ہوازن کا وفد اپنے قیدیوں کی رہائیوں کے لیے حاضر ہوا تو نبی اکرم ﷺ نے ان قیدیوں کے مالکان کی رضامندی سے چھ ہزار قیدیوں کو رہا کیا۔ جن لوگوں نے ان کا معاوضہ لینا چاہا، انہیں بیت المال سے معاوضہ ادا کر دیا گیا۔[2]

۳۔ غلامی کی ممانعت اور انسان کی آزادی کا تقدس (sanctity) وہ اصل کلی یا کلی اصول (grand principle) ہے، جو نصوص سے فی الجملہ ثابت ہے۔ یہ وہ اصل الاصول جس کی

۱۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورۃ محمد، ص ۱۴

۲۔ تفہیم القرآن ۵: ۱۷

توثیق بہت سی نصوص فی الجملہ کرتی ہیں، خواہ وہ کسی معین نص (specific text) سے ثابت نہ بھی ہو۔ چند مثالیں ذیل میں دی جاتی ہے۔

۱۔ کفارۂ ظہار

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَالَّذِينَ يُظَاهِرُونَ مِنْ نِسَائِهِمْ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا قَالُوا فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَتَمَاسَّا ذَلِكُمْ تُوعَظُونَ بِهِ وَاللهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾ [المجادلہ۵۸: ۳] (جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کریں پھر اس بات سے رجوع کریں جو انہوں نے کہی تھی، تو قبل اس کے دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں، ایک غلام آزاد کرنا ہوگا، اس سے تم کو نصیحت کی جاتی ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے)۔

یہاں ظہار کے کفارے کے طور پر غلام کو آزاد کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔

۲۔ قتل خطا کا کفارہ

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلا خَطَأً وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَى أَهْلِهِ إِلا أَنْ يَصَّدَّقُوا فَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ فَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَى أَهْلِهِ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِنَ اللهِ وَكَانَ اللهُ عَلِيمًا حَكِيمًا﴾ [النساء۴: ۹۲] (کسی مومن کا یہ کام نہیں ہے کہ دوسرے مومن کو قتل کرے، الّا یہ کہ اس سے چوک ہو جائے۔ اور جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ ایک مومن کو غلامی سے آزاد کرے اور مقتول کے وارثوں کو خون بہا دے، اِلّا یہ کہ وہ خون بہا معاف کر دیں۔ لیکن اگر وہ مسلمان مقتول کسی ایسی قوم سے تھا جس سے تمہاری دشمنی ہو تو اس کا کفّارہ ایک مومن غلام آزاد کرنا ہے۔ اور اگر وہ کسی ایسی غیر مسلم قوم کا فرد تھا جس سے تمہارا معاہدہ ہو تو اس کے وارثوں کو خوں بہا دیا جائے گا اور ایک مومن غلام کو آزاد کرنا

ہو گا۔ پھر جو غلام نہ پائے وہ پے در پے دو مہینے کے روزے رکھے۔ یہ اس گناہ پر اللہ سے توبہ کرنے کا طریقہ ہے اور اللہ عالم و دانا ہے)۔

۳۔ قسم توڑنے کا کفارہ

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لا يُؤَاخِذُكُمُ اللهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ وَلَكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُمُ الأَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِينَ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعِمُونَ أَهْلِيكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ أَوْ تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلاثَةِ أَيَّامٍ ذَلِكَ كَفَّارَةُ أَيْمَانِكُمْ إِذَا حَلَفْتُمْ وَاحْفَظُوا أَيْمَانَكُمْ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ [المائدۃ۵: ۸۹] (تم لوگ جو مہمل قسمیں کھا لیتے ہو ان پر اللہ گرفت نہیں کرتا، مگر جو قسمیں تم جان بوجھ کر کھاتے ہو ان پر وہ ضرور تم سے مواخذہ کرے گا۔ [ایسی قسم توڑنے کا] کفّارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو وہ اوسط درجہ کا کھانا کھلاؤ جو تم اپنے بال بچوں کو کھلاتے ہو، یا انہیں کپڑے پہناؤ، یا ایک غلام آزاد کرو، اور جو اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ تین دن کے روزے رکھے۔ یہ تمہاری قسموں کا کفّارہ ہے جبکہ تم قسم کھا کر توڑ دو۔ اپنی قسموں کی حفاظت کیا کرو۔ اس طرح اللہ اپنے احکام تمہارے لیے واضح کرتا ہے شاید کہ تم شکر ادا کرو)۔

قرآن کی متعدد آیات و احادیث نبویہ میں غلام کو آزاد کرنے کے عمل کو نیکی اور تقوی کے اعلیٰ اعمال میں شمار کیا گیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ سے جنت کے قریب لے جانے والے اور دوزخ سے دور کرنے والے عمل کی بابت پوچھا تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: کسی غلام کو آزاد کرو۔

جیسے کہ ابتدا میں کہا گیا ہے کہ اسلام نے بامر مجبوری ابتدا میں غلامی کو برداشت کیا، گو کہ یہ اس کی بنیادی اقدار اور اصولوں سے میل نہیں کھاتی تھی؛ تاہم اس کے ساتھ ہی کئی ایسے راستے کھولے اور طریقے تجویز کیے جن کے ذریعے مقصود شرع یعنی انسانی آزادی کو حاصل کیا جا سکتا تھا۔ مثلاً ایک غلام معین خدمت کے عوض "مکاتبت" کے ذریعے آزادی حاصل کر سکتا تھا۔ اسی طرح

جب باندی آقا کے بچے کی ماں بن جاتی تو وہ "ام الولد" کہلاتی اور آزاد ہو جاتی۔ اس سلسلے میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اسے بیٹے نے آزادی دے دی۔[1]

اس سے یہ معلوم ہوا کہ انسانی آزادی اسلام کا اصل الاصول یا کلی اصول (grand principle) ہے۔ آزادی کی جڑیں قرآن و سنت میں پیوست ہیں۔ دوسرے الفاظ میں: "الحرية متجذرة في الإسلام" غلامی کی ممانعت کے حوالے سے اسلام کا اصل موقف ہے۔ داعش کا یہ موقف غلط ہے کہ یزیدی مذہب کی عورتوں کو باندیاں بنانا قرآن و سنت کی روشنی میں جائز ہے؛ کیونکہ قرآن و سنت نے کفار کے قیدیوں کو غلام بنانے کی اجازت دی ہے۔ قرآن نے جنگ کی صورت حال میں ایک خاص تاریخی عرف کے تناظر میں غلامی کو قبول کیا تھا۔ جنگ سے ہٹ کر کبھی بھی کسی آزاد انسان کو غلام بنانے کی اجازت نہیں تھی۔ موجودہ صورت حال میں یزیدیوں اور داعش کے درمیان کوئی جنگ نہیں ہوئی تھی۔ داعش کے خلاف یزیدیوں کی طرف سے کسی لڑائی یا جارحیت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ لہٰذا قیدیوں کو غلام بنانے کی فقہی شرائط داعش کے معاملے میں پوری نہیں ہوتیں۔ سوال یہ ہے کہ ایک آزاد انسان کو کیسے غلام بنایا جا سکتا ہے؟

"معاملہ بالمثل" کا اصول بھی غلط ہے۔ معاملہ بالمثل کا مفہوم یہ ہے کہ کفار ہمارے ساتھ جس طرح کا معاملہ کریں گے، ہم مسلمان بھی ان کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کریں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ گویا ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمارے اپنے کوئی اصول اور ہماری اپنی کوئی اخلاقی اقدار نہیں کہ جن سے ہم راہنمائی حاصل کر سکیں۔ یہ سوال بھی غور طلب ہے کہ کیا ہم نے غلامی کی ممانعت کے قانون کو دیگر اقوام کے ساتھ معاہدے کی بنا پر قبول کیا ہے، یا حریت انسانی، اور تکریم انسانیت جیسی ہماری اپنی اقدار (indigenous value) کی وجہ سے قبول کیا ہے؟ پہلی صورت میں غلامی کی ممانعت کا قانون مسلم معاشروں میں زیادہ پذیرائی نہیں حاصل کر سکتا، کیونکہ اس کی بنیاد بین

۱۔ دیکھیے: مجموعہ مقالات بین الاقوامی قانون انسانیت اور اسلام، ترتیب و تدوین: ڈاکٹر عامر الزمالی، ترجمہ: محمد مشتاق احمد، بین الاقوامی ریڈ کراس کمیٹی، ص ۴۰

الاقوامی قانون ہے نہ کہ شریعت۔ لہٰذا اس ممانعت کو محکم شرعی بنیاد فراہم کرنا ضروری ہے، جو کہ انسانی شرف و آبرو، تکریم انسانیت، حریت و آزادی، عدل و مساوات جیسے اصول ہیں۔

مبحث چہارم: بیوی کی رضامندی کے بغیر مجامعت یا ازدواجی عصمت دری

جدید بین الاقوامی قانون حقوق انسانی بیوی کے ساتھ اس کی رضامندی کے بغیر مجامعت کو بھی جنسی تشدد اور جنسی زیادتی قرار دیتا ہے۔ اقوام متحدہ کا نظام اقدار (value system) اور بین الاقامی قانون حقوق انسانی میں اس تصور کے لیے marital rape یعنی ازدواجی عصمت دری کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ اقوام متحدہ کی سرپرستی میں حقوق نسواں کے اس تصور کو کئی ممالک نے اپنے قانونی نظام کا حصہ بنایا ہے۔ دنیا کے بیشتر ممالک اور خاص طور پر مغربی ممالک میں ازدواجی عصمت دری ان کے ضابطہ فوجداری کا حصہ ہے۔ ان ممالک میں یہ فعل قانوناً جرم ہے، جس کے لیے سزا مقرر ہے۔ امریکہ، برطانیہ، آسٹریلیا، بیلجیم، کینیڈا، فرانس، جرمنی، جاپان، روس سمیت دنیا کے تقریباً ۱۰۶ ممالک میں ازدواجی عصمت دری، جنسی تشدد اور جنسی زیادتی کے زمرے میں آتی ہے۔ اقوام متحدہ نے اپنی ایک رپورٹ (۲۰۰۶ء) میں تشویش کا اظہار کیا ہے کہ ۵۲ ممالک نے بیوی کے ساتھ شوہر کے بلا رضا جنسی تعلق کو جرم تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے، ان ممالک میں اسلامی ممالک اور خاص طور پر پاکستان شامل ہے۔

اگر اقوام متحدہ کے اس ایجنڈے کا بغور مطالعہ کیا جاتا ہے، تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس تحریک کے پس پشت جو فلسفہ کارفرما ہے وہ ہے: "میرا جسم میری مرضی"۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جسم عورت کا ہے، اس پر تصرف کا حق صرف اسی کو حاصل ہے۔ اس پر کوئی اور فرد تصرف نہیں کر سکتا۔

اسلامی ممالک میں عموماً "ازدواجی عصمت دری" کو قابل سزا جرم بنانے کی تحریک کو پذیرائی نہیں ملی۔ مصر میں حقوق نسواں کے لیے سرگرم تنظیموں کا یہ بہت ہی مقبول نعرہ ہے، جسے ذرائع ابلاغ کی تائید و سرپرستی حاصل ہے۔ مصر میں علما کی طرف سے اس پر شدید ردعمل آیا ہے۔

"ازدواجی عصمت دری" (marital rape) کے تصور کا اگر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ شریعت میں ازدواجی عصمت دری کا کوئی تصور نہیں۔ رشتۂ نکاح کا مقصد ہی جنسی تمتع اور نسل کو آگے بڑھانا ہے۔ مرد اور عورت جب معاہدۂ نکاح میں داخل ہوتے ہیں، تو وہ گویا جنسی تعلق پر رضامندی کا اظہار کرتے ہیں۔ معاہدہ نکاح جنسی تعلق قائم کرنے پر فریقین کے اتفاق کا نام ہے۔ ہر جنسی عمل کے لیے علاحدہ سے اتفاق یا رضامندی (separate agreement) کی ضرورت نہیں۔ اگر جنسی عمل معاہدہ نکاح کا حصہ ہے، تو پھر اسے زنا بالجبر اور عصمت دری کیسے کہا جاسکتا ہے؟ اگر رضامندی کے بغیر عورت سے مجامعت جرم ہو، اور عورت کو یہ حق ہو کہ وہ پولیس کو اس کی اطلاع دے، اور عدالت میں مرد پر مقدمہ کرے، تو ایسی عورت گھر میں کس خوشگوار زندگی کی توقع کر سکتی ہے؟ اسلام کی نگاہ میں نکاح ایک معاشرتی، روحانی رشتہ ہے جو محبت و الفت، شفقت و ہمدردی اور ایثار و قربانی جیسی اخلاقی اور روحانی اقدار پر استوار ہوتا ہے۔ ازدواجی عصمت دری جیسے تصورات ان اخلاقی و روحانی اقدار سے متصادم ہیں۔

قرآن مجید کا ارشاد ہے: ﴿وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً﴾ [الروم ۳۰: ۲۱] (اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہاری ہی جنس سے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے آرام پاؤ، اور اس نے تمہارے درمیان محبت و ہمدردی قائم کر دی)۔

اسی سکون و باہمی پیار کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ مرد اس بات کا خیال رکھے کہ اگر بیوی بیمار ہے یا ذہنی اور نفسیاتی کرب کا شکار ہے، تو ایسی کیفیت میں اسے جنسی عمل پر مجبور کرنے کی بجائے اس کے آرام کا خیال کرے۔

شریعت کی رو سے جنسی ضرورت کی تکمیل مرد اور عورت دونوں کا حق ہے۔ یہ مرد کا حق اور بیوی کی ذمہ داری ہے، اسی طرح یہ عورت کا حق اور مرد کی ذمہ داری ہے۔ ایلاء، ظہار اور دیگر

تمام شکلیں جس میں مرد عورت سے جنسی تعلق توڑتا ہے، شریعت میں ممنوع ہیں۔ فقہا کی غالب رائے یہ ہے کہ جماع اور مباشرت (sexual intercourse) مرد و عورت دونوں کا حق ہے۔ مالکی اور حنبلی یہ رائے رکھتے ہیں کہ مرد بیوی سے کسی وقت بھی مباشرت کا مطالبہ کر سکتا ہے، بشرطیکہ کوئی ایسی وجہ موجود نہ ہو جس کی بنا پر وہ مباشرت کے لیے تیار نہ ہو۔ تاہم اس کی جسمانی و ذہنی کیفیت کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے جنسی عمل پر مجبور کرنا قطعی طور پر اسلامی تعلیمات کے مطابق نہیں ہے، قرآن کہتا ہے: ﴿وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ [النساء۴: ۱۹]۔

حسن معاشرت کا تقاضا یہ ہے کہ جنسی تعلق باہمی رضامندی اور محبت و پیار کے ساتھ اور بلا جبر و اکراہ ہو۔ لیکن اگر عورت بلا عذر شرعی مرد کو انکار کر دیتی ہے، تو حدیث میں آتا ہے کہ ایسی عورت موجب لعنت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: إذا دعا الرجل امرأته إلى فراشه، فأبت أن تجيء، لعنتها الملائكة حتى تصبح[1] (اگر کوئی مرد بیوی کو مباشرت کی دعوت دے اور وہ انکار کر دے تو ساری رات فرشتے اس پر لعنت کرتے رہتے ہیں)۔

ایک اور حدیث میں ہے: أيما امرأة باتت وزوجها عليها ساخط لعنتها الملائكة حتى تصبح (کوئی بھی عورت اس حال میں رات بسر کرے کہ اس کا شوہر اس پر ناراض ہو، تو فرشتے اس پر صبح ہونے تک لعنت کرتے رہتے ہیں)۔

"ازدواجی عصمت دری" اور علما کا موقف

جامعہ ازہر کے ایک ممتاز عالم دین ڈاکٹر احمد کریمہ کہتے ہیں کہ "ازدواجی عصمت دری" کی اصطلاح اسلام میں نہیں ہے۔ رشتہ ازدواج محبت و پیار کا رشتہ ہے، جبر و اکراہ کے ذریعے جنسی تعلق اسلام کا مطلوب نہیں ہے۔ فرشتوں کی لعنت والی حدیث کے حوالے سے ڈاکٹر احمد کریمہ

۱۔ مختلف الفاظ کے ساتھ یہ حدیث کتب حدیث میں وارد ہوئی ہے، دیکھیے: صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب إذا باتت المرأة مهاجرة فراش زوجها، حدیث ۵۱۹۳

نے تحفظات کا اظہار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر عورت مجامعت کی خواہش کرے اور مرد انکار کر دے تو کیا وہ مرد بھی موجب لعنت ہو گا؟

شیخ الازہر ڈاکٹر احمد الطیب کہتے ہیں کہ معاہدہ نکاح شرعی معاہدہ ہے، نہ کہ سول معاہدہ (civil contract) اس پر بہت سے شرعی نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ حق تمتع اور حق حسن معاشرت دو ایسے مشترکہ حقوق ہیں جو اس معاہدہ نکاح پر مرتب ہوتے ہیں۔ ہمارے عرف و رواج میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ حق تمتع (conjugal right) صرف مرد کا حق ہے، حالانکہ یہ درست نہیں۔ جس طرح مرد کو مباشرت کے مطالبے کا حق حاصل ہے، اسی طرح عورت کو بھی یہ حق حاصل ہے۔ حسن معاشرت کا تقاضا یہ ہے کہ جنسی تعلق سے پہلے بھی نرمی، پیار اور محبت کی فضا قائم ہو تاکہ عورت جنسی تعلق کے لیے تیار ہو۔

مرکز الازہر العالمی للفتوی الالکترونیۃ کے ایک بیان میں کہا گیا ہے کہ فرشتوں کی لعنت والی حدیث سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ مرد ہر صورت میں عورت کو جنسی عمل پر مجبور کر سکتا ہے، غلط ہے۔ بیان میں کہا گیا ہے کہ ازدواجی رشتہ محبت، رحم دلی، باہمی احترام، رازوں کی حفاظت جیسی اقدار پر قائم ہوتا ہے، عورت کو جسمانی اور ذہنی تکلیف پہنچا کر اپنی جنسی ضرورت کی تسکین اس رشتے کے تقاضوں کے خلاف ہے۔

دارالافتاء المصریہ نے یہ فتوی دیا ہے کہ عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مرد کو جنسی عمل سے منع کرے، اگر (بیوی) اس کے لیے جسمانی اور ذہنی طور پر تیار نہ ہو۔ ایسی صورت میں عورت کے ساتھ جبراً جنسی تعلق قائم کرنا درست نہیں۔ دار الافتاء المصریہ کا یہ فتوی ایک غلط مفروضے پر قائم ہے کہ ہر بلا رضا جنسی تعلق ایذا رسانی اور مار پیٹ سے شروع ہوتا ہے، اور چونکہ ایذا اور ضرر رسانی ناجائز ہے، لہٰذا اس طرح کا جنسی تعلق جنسی تشدد شمار ہو گا۔ دارالافتاء المصریہ اس حقیقت کو فراموش کر گیا ہے کہ اقوام متحدہ اور حقوق انسانی کی تنظیمیں ہر بلا رضا جنسی تعلق کو

جنسی تشدد کہتی ہیں، چاہے اس میں جسمانی ایذا نہ بھی شامل ہو۔ یہ اس فلسفہ پر مبنی ہے کہ عورت اپنے جسم کی تنہا مالک ہے۔

دارالافتاء المصریۃ کے اس فتوے سے یہ اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے کہ حقوق نسواں کی یہ تحریک اسلامی دنیا میں کتنی تیزی سے قوت حاصل کر رہی ہے کہ اس تیز و تند دھارے کے سامنے علمائے دین بھی اپنے آپ کو بے بس پاتے ہیں اور مفاہمت کے راستے تلاش کرتے ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ رشتۂ ازدواج محبت، پیار، باہمی اعتماد و باہمی احترام کا رشتہ ہے، لیکن جائز مباشرت کو قانونی جرم بنانا اور شوہر کو عدالت میں گھسیٹنا کس طرح گھریلو تعلق کو خوشگوار رکھ سکتا ہے؟ اگر مرد کو اس کے حق سے محروم کر دیا جائے تو وہ حرام راستے تلاش کرے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ طلاق کا راستہ اختیار کرے۔ اس میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ مرد و عورت کے خلوت کے تعلقات عدالتوں میں کس طرح وکیلوں کی بحثوں کا موضوع بن سکتے ہیں؟ قرآن نے مرد اور عورت کے تعلق کو "لباس" سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن کہتا ہے: ﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ﴾ [البقرۃ۲: ۱۸۷] (وہ تمہارا لباس ہیں اور تم ان کے لباس ہو)۔ جس طرح لباس اور جسم کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوتا، اسی طرح ان کا باہمی تعلق غیر منفک ہوتا ہے۔ اس جنسی تعلق کو عدالت میں زیر بحث لانا جسم اور لباس کے اس رشتے اور تعلق کو ختم کرنا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ "ازدواجی عصمت دری" کو قابل سزا جرم بنانے کی تحریک مسلمان معاشرے کی نظریاتی جڑیں کھوکھلا کرنے کی تحریک ہے۔ یہ جنسی اباحت و بے راہ روی کا دروازہ کھولنے کا راستہ ہے۔ اس دور میں بھی مسلمانوں کا سب سے مضبوط ادارہ خاندان کا ادارہ ہے۔

اقوام متحدہ کا ایجنڈا اور ہدف درحقیقت اس قلعے کو مسمار کرنا ہے۔ تحریک آزادئ نسواں دراصل مغربی سیکولر تہذیب کا ایک فکری پروگرام ہے، جسے بین الاقوامی اداروں کے ذریعے عالمگیر رنگ دیا جارہا ہے۔ گزشتہ چند عشروں میں صنفی مساوات اور مساوی حقوق کے تصور پر مبنی متعدد عالمی کنونشن اور معاہدات ہوئے ہیں، جو اپنی روح اور مزاج میں سیکولر ہیں اور اسلام کے

نظام فکر اور اس کی اخلاقی اقدار سے متصادم ہیں۔ اسلامی تصور خاندان کا ایک امتیازی وصف بیوی کا شوہر کی وفادار اور اطاعت گزار ہونا ہے۔ قرآن کی نگاہ میں ایک مثالی بیوی شوہر کی رضاکارانہ اطاعت گزار ہوتی ہے۔ وہ اس کی عزت وناموس اور اس کے رازوں کی امین و محافظ ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللهُ﴾ [النساء۴: ۳۴] (پس جو نیک بیبیاں ہیں وہ فرمانبرداری کرنے والی، رازوں کی حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں۔ اس بنا پر کہ خدا نے بھی رازوں کی حفاظت فرمائی ہے)۔

اس آیت کی تشریح میں سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں: قانتات کا مفہوم یہ ہے کہ ایک نیک اور مثالی بیوی برضا و رغبت فرماں بردار ہوتی ہے۔ وہ اطاعت اس بنا پر نہیں کرتی کہ اسے اطاعت پر مجبور کیا گیا ہے، بلکہ وہ اپنی خوشی سے اطاعت گزاری کا انتخاب کرتی ہے۔ وہ یہ بات پسند کرتی ہے کہ وہ فرماں بردار کہلائے۔ وہ اطاعت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کوشاں رہتی ہے۔ اس کے اس طرز عمل کی بنا پر قرآن نے اسے محض فرماں بردار نہیں قرار دیا، قانتات یعنی ایک مخلص فرماں بردار قرار دیا ہے۔ یہ رویہ اس باہمی محبت و شفقت اور اعتماد و ایثار کا ایک منطقی نتیجہ ہے جو اسلام زمین پر قائم کرنا چاہتا ہے۔[1]

اسلام زوجین کے درمیان محبت و شفقت، احترام و ہمدردی، ایثار و اعتماد کا رشتہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس صنفی تعلقات کا مغربی تصور مرد کو عورت کے حریف کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اس تصور کے ساتھ جب عورت عائلی زندگی میں داخل ہوتی ہے، گھریلو زندگی میں مرد کے کسی کردار کو تسلیم کرنے کے لیے وہ تیار نہیں ہوتی، چنانچہ نفرتیں جنم لیتی ہیں اور گھریلو زندگی بربادی کا شکار ہوتی ہے۔[2]

۱۔ دیکھیے: سید قطب، فی ظلال القرآن ۳: ۶۵۲

۲۔ دیکھیے: ڈاکٹر محمد طاہر منصوری، خاندان: درپیش مسائل اور ان کا حل، مطبوعہ: عورت، خاندان اور ہمارا معاشرہ: مسائل اور لائحہ عمل، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، ص ۳۰- ۴۶

خلاصہ اور نتائج

جنگی تنازعات میں جنسی تشدد اس عہد کا ایک سنگین انسانی مسئلہ ہے جس نے تکریم انسانیت اور انسانی شرف و آبرو جیسی مسلمہ عالمی انسانی اور اسلامی اقدار کو برے طریقے سے پامال اور مجروح کیا ہے، جنگ میں جنسی تشدد فاتح اور طاقتور قوم کا ایک جنگی ہتھیار اور اس کی جنگی حکمت عملی کا حصہ ہوتا ہے۔ اس کا مقصد مقہور و مغلوب قوم کی اہانت اور اس کے حوصلے پست کرنا ہوتا ہے۔

بین الاقوامی قانون انسانیت جنسی تشدد کو صرف جنسی عمل تک محدود نہیں رکھتا، بلکہ بہت سے دیگر افعال بھی اس کا حصہ ہوتے ہیں۔

بین الاقوامی قانون انسانیت، اور قانون حقوق انسانی کی رو سے جنگ میں عورتوں کو باندیاں بنانا، ان سے جبری جنسی تعلق قائم کرنا، انہیں جنسی پیشہ کے لیے استعمال کرنا، بچوں کے ساتھ بد فعلی، انسانی تجارت، جبری حمل، جبری نس بندی، ازدواجی عصمت دری (marital rape) وغیرہ جنسی تشدد کی مختلف صورتیں ہیں۔

جنسی تشدد اور انسان پر تشدد کی دیگر رائج شکلیں اسلام میں حرام ہیں۔ اسلام انسانی شرف و آبرو کے تحفظ اور تکریم انسانیت پر زور دیتا ہے۔ بلا عذر شرعی کسی کو ضرر اور ایذا پہنچانا شریعت میں حرام ہے۔ حالت جنگ میں عورتوں کو اغوا کرنا اور ان کی عصمت دری "فساد فی الارض" اور "حرابہ" کی شکلیں ہیں جو ایک بڑا گناہ اور سنگین جرم ہے۔

اسلام انسان کی غلامی کی نفی کرتا ہے۔ انسانی حریت و آزادی اسلام کے بنیادی کلیات اور اصولوں میں سے ہے۔ ابتدائے اسلام میں غلامی کو بامر مجبوری برداشت کیا گیا، کیونکہ اس کے قطعی انسداد کے لیے غیر مسلموں کا تعاون اور حمایت بھی ضروری تھی۔ اسلام اس وقت تک غلامی کا قطعی انسداد نہیں کر سکتا تھا جب تک کہ باقی دنیا بھی جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کی ممانعت کا قطعی

فیصلہ نہ کر لیتی۔ لہٰذا غلامی کی ممانعت عین اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے، یہ ایک اٹل، دائمی اور محکم شرعی حکم ہے۔

"ازدواجی عصمت دری" (marital rape) کا اسلام میں کوئی تصور نہیں۔ معاہدہ نکاح میں خود بخود یہ بات شامل ہے کہ عورت برضا و رغبت اپنا جسم اپنے شوہر کے حوالے کرے گی۔ یہ جنسی عمل یا مباشرت کے لیے کسی زبانی یا تحریری رضامندی اور موافقت کی ضرورت نہیں۔ میاں بیوی کے درمیان جنسی تعلق کو کسی قانون کے ذریعے منضبط نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایک مغربی اور سیکولر ایجنڈا ہے، جس کا مقصد مسلم معاشرے کے خاندانی نظام کو توڑنا اور برباد کرنا ہے۔

پاکستان میں "ازدواجی عصمت دری"

پاکستان میں ازدواجی عصمت دری (marital rape) کے کصور کو عموماً پذیرائی حاصل نہیں ہوئی۔ رشتۂ نکاح کے تقدس (sanctity) کے پیش نظر پاکستانی معاشرے میں اسے معیوب سمجھا جاتا ہے کہ میاں بیوی کے جنسی تعلق کو عدالتوں میں زیر بحث لایا جائے۔ 1979ء کا پاکستانی فوجداری قانون عصمت دری (rape) کی ان الفاظ میں تعریف کرتا ہے: "عصمت دری (rape) وہ جبری جنسی تعلق ہے جو کسی غیر منکوحہ عورت کے ساتھ قائم کیا گیا ہو"۔

2006ء کے ویمن پروٹیکشن ایکٹ (women protection act) میں منکوحہ یا رشتہ ازدواج کے استثنا کو ختم کر دیا گیا۔ اس میں یہ کہا گیا کہ عورت کے ساتھ جبری جنسی تعلق (عورت کی مرضی کے بغیر جنسی تعلق) قابل تعزیر جرم ہے۔ تاہم قانون میں یہ ابہام موجود ہے کہ آیا اس کا اطلاق رشتہ ازدواج سے باہر جبری جنسی تعلق پر ہو گا یا منکوحہ بیوی کے ساتھ بلا رجا جنسی تعلق پر بھی ہو گا۔ ضابطہ فوجداری پاکستان کی دفعہ 375 میں جنسی عصمت دری (rape) کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: "اگر کوئی شخص کسی عورت کی رضامندی کے بغیر اس سے جنسی تعلق قائم کرے گا تو وہ عصمت دری (rape) کا مرتکب ہو گا۔

ضابطہ فوجداری پاکستان میں عصمت دری (rape) کے لیے سزائے موت یا ۱۰ سا ۲۵ سال کی سزا مقرر کی گئی ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ پاکستانی معاشرے کی مخصوص دینی شناخت اس مقصد کو قبول نہیں کر پاتی ہے۔ عدالتوں میں اس حوالے سے کوئی شکایت نہیں گئی اور نہ اس طرح کے مقدمات کو درخور اعتناء سمجھا گیا ہے۔[1]

سوال وجواب

شگفتہ عمر: جب ہم فقہ اسلامی کی کتابوں کو دیکھتے ہیں، جن میں بیوی کے فرائض لکھے گئے ہوتے ہیں؛ تو ان میں دو تین چیزیں بڑی وضاحت سے بیان کی جاتی ہیں۔ اور بعض احادیث سیاق و سباق سے ہٹ کر بیان کی جاتی ہیں جیسے کہ اس عورت پر فرشتوں کی لعنت ہوتی ہے جو مرد کو انکار کر دے، یا وہ جب بھی بلائے تو وہ آئے چاہے گھوڑے پر ہی کیوں نہ ہو۔ نیز اس قبیل کی دیگر احادیث ان کتابوں میں پائی جاتی ہیں جو عوام تک پہنچتی ہیں۔ مردوں کے لیے بھی بہت ساری تعلیمات احادیث کی کتب میں موجود ہیں، جہاں ان کو عورتوں پر تشدد کرنے سے منع کیا گیا ہے، لیکن وہ شاید بڑی تفاسیر یا ایسی کتابوں میں ہیں جن تک عوام کی رسائی نہیں ہے۔ ہم ایسی آرگنائزیشن میں کام کرتے ہیں جس میں ہمارا واسطہ ایسی خواتین سے پڑتا ہے جو اس طرح کے مسائل سے دوچار ہوتی ہیں۔ ان رویوں کے علاوہ بھی ایسے رویے ہیں جن سے ہمارا واسطہ تو شاید اتنا زیادہ نہ پڑتا ہو، لیکن مغرب میں یہ رویے عام ہیں، جیسے غیر فطری جنسی عمل ہے یا مخصوص ایام کے دوران ہم بستری وغیرہ ہے۔ ان مسائل کے حوالے سے ہمارا بالعموم رویہ یہ ہوتا ہے کہ یہ غیروں کی سازش ہے، لیکن جو خلا اس حوالے سے ہمارے نظام میں موجود ہیں کیا اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت نہیں؟

1. Marital rape in Pakistan by Anna Maghalana comploi, www.gurd.orgsmarital-rape-inpakistan

پروفیسر ڈاکٹر فرخندہ ضیاء: ادارہ خاندان کو بین الاقوامی قانون میں بھی تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن خاندان کا ڈھانچہ کس طرح ہونا چاہیے اور اس کو کیسے چلایا جائے، اس حوالے سے اسلامی قانون مغربی قانون سے یکسر مختلف ہے۔ مغرب میں چھوٹے خاندان کا تصور پایا جاتا ہے۔ سٹریٹ چلڈرن کا مسئلہ بھی وہاں پر زیادہ ہے۔ میرے خیال میں اگر ادارہ خاندان مضبوط ہو تو اس خاندان میں بچے ایک بہترین ماحول میں پلے ہوتے ہیں اور اس کے اثرات گھر اور ملک سے ہوتے ہوئے عالمی سطح تک جاتے ہیں۔ مغرب نے اپنا ادارہ خاندان خود تباہ کیا ہے، اور اب اسے اس کے منفی اثرات کا سامنا ہے؛ کیونکہ جب انسان کسی چیز کی انتہا پر چلے جاتے ہیں اور اپنی حدود سے تجاوز کرتے ہیں تو اس سے مسائل پیدا ہونا فطرتی بات ہے۔ اس کے برعکس ہمارے پاس تو ایک پورا نظام ہے۔

ڈاکٹر طاہر منصوری: ازدواجی عصمت دری یا میریٹل ریپ کی اصطلاح ہمارے یہاں بحث مباحثے کا موضوع نہیں ہے، صرف حقوق انسانی کے کارکن اس کو جانتے ہیں اور اس حوالے سے آواز بلند کرتے رہتے ہیں۔ مصر میں چونکہ آزادی نسواں کی تحریک زیادہ مضبوط ہے؛ اس لیے وہاں اس موضوع پر باقاعدہ ٹی وی ٹاک شو اور پروگرام ہوتے رہتے ہیں تو علما کو لازمی طور پر اس کا جواب دینا پڑتا ہے۔ شیخ الازہر ڈاکٹر احمد الطیب نے یہ بات کہی ہے کہ شادی ایک دیوانی معاہدہ نہیں ہے، بلکہ شرعی معاہدہ ہے، جس میں حق تمتع ہے، حق مہر ہے، حسن معاشرت ہے۔ یہ سب کے سب اس میں شامل ہیں؛ تاہم انہوں نے جو سب سے اہم بات کی ہے وہ یہ کہ نکاح کا رشتہ محبت اور مودت کا ہوتا ہے؛ لہٰذا جنسی تعلق کے لیے اکراہ یا مجبور کرنا غلط ہے، فرشتوں کی لعنت والی احادیث سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ مرد ہر صورت میں عورت کو مجبور کر سکتا ہے، یہ بات بالکل غلط ہے۔ اپنی رائے کے حق میں انہوں نے باقاعدہ دلائل دیے ہیں: ﴿لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً﴾ [الروم۳۰: ۲۱] ﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ﴾ [البقرۃ۲: ۱۸۷] یعنی اس کے اندر ایک طرح کی رازداری، محبت اور اعتماد کا وجود ہوتا ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہم

نے اس کو اس طرح رسپونڈ کیا ہے جیسا کہ ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ آپ کا ایک طرح کا حق ہے اور اس کا حق نہیں ہے۔

شریعت میں ظہار یا ایلاء کی حوصلہ شکنی اس لیے کی گئی ہے کہ اس سے بیوی کو ایک حق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر آپ اس کو لباس اور رازداری کا معاملہ قرار دیتے ہیں تو اس کا حل بھی درون خانہ ہو گا، نہ کہ کسی بیرونی ذریعے سے۔ یہ نہیں ہو گا کہ عورت یہ معاملہ عدالت میں لے جائے کہ میرے ساتھ زبردستی ہوئی ہے، لہٰذا میری چارہ جوئی کی جائے اور پھر وکیل اس پر جرح کرے کہ یہ کیوں ہوا، یا کیسے ہوا اور اس طرح ایک انتہائی رازداری کا معاملہ یوں بحث و مباحثے کا موضوع بنے۔ ابھی تو ہم اس سے مکمل عدم توجہی کا برتاؤ کر رہے ہیں، لیکن ایسا ممکن ہے کہ کوئی واقعی اکراہ کر رہا ہو تو میرے مطالعے کی حد تک ایسے فتاویٰ موجود ہیں جو اس حق کو میاں بیوی دونوں کا حق قرار دیتے ہیں۔ لہٰذا جنسی عمل دونوں کی رضامندی سے ہو اور اس میں کوئی اکراہ نہیں ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر ضیاء اللہ رحمانی: ڈاکٹر طاہر منصوری صاحب نے جو بات کی ہے اس حوالے سے قرآن مجید کی بہت خوب صورت آیت ہے: ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ [البقرۃ۲: ۲۲۸] حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کی ایک خاص سیاق میں تفسیر فرمائی ہے کہ میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ میں اپنی بیوی کے لیے بن ٹھن کر رہوں، جیسا کہ میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ بیوی بھی میرے لیے بن ٹھن کر رہے۔ ہمارے ہاں جو یہ تصور ہے کہ بس بیوی نے بن سنور کر رہنا ہے اور شوہر سے چاہے پسینے کی بو آ رہی ہو، یہ درست نہیں ہے۔

مفتی محمد زاہد: ازدواجی عصمت دری ایک ایسا ایشو ہے جس پر ہمارے معاشرے میں بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ فرشتوں کی لعنت والی روایت سند کے اعتبار سے بالکل درست ہے اور اس کی جو تشریح ڈاکٹر محمد طاہر منصوری صاحب نے کی ہے فقہا نے اسی کو اصل اصول بنایا ہے۔ اس پر باقاعدہ تحقیقی کام ہو سکتا ہے کہ فقہا نے اس اصول کو کہاں اور کس انداز سے اپنایا ہے۔ مرد کو

کہا گیا ہے کہ عورت سے اظہار ناراضی کے لیے اپنے آپ کو اس سے الگ کرلے، جنسی تعلق قطع کرلے۔ لعنتها الملائكة والی روایت سے اس وقت استدلال کیا جائے گا جب عورت بلاوجہ مرد کو تنگ کرنے کے لیے ایسا کرے، جیسے مرد کرتا ہے، فتذروها كالمعلقه تو اسی طرح سے فتذره كالمعلق کے وقت یہ قابل استدلال ہو گا۔

میں سنن ترمذی کی شرح لکھ رہا ہوں، جس میں آج کل یہی حدیثیں زیر بحث ہیں۔ ان میں سے مذکورہ حدیث تو سنداً صحیح ہے، لیکن اس طرح کی زیادہ تر احادیث پر محدثین نے شدید تحفظات کا اظہار کیا ہے۔ جیسا کہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اگر بیوی خاوند کے زخم بھی چاٹ لے تو اس کا حق ادا نہیں ہوتا، اس طرح کے الفاظ اللہ تعالیٰ کے نبی استعمال نہیں کر سکتے۔ اسی لیے محدثین نے بہت سخت الفاظ میں ان احادیث پر نقد کیا ہے۔ اس طرح کی جو چیزیں ہم یک طرفہ عوام کے سامنے بیان کرتے ہیں، اس حوالے سے بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔

جنسی تشدد کے متاثرین کے علاج اور امداد کے حوالے سے معاشرے کی ذمہ داری: اسلامی سماجی نقطہ نظر

محمد عمار خان ناصر *

جنسی تشدد کے دائرے میں آنے والے جرائم کی نوعیت کے لحاظ سے چار بنیادی صورتیں ہو سکتی ہیں:

۱۔ عام زندگی میں کسی خاتون کی آبروریزی

۲۔ دوران جنگ میں دشمن سے تعلق رکھنے والی خواتین کی آبرو ریزی

۳۔ بچوں کا جنسی استحصال

۴۔ خواجہ سرا طبقے کا جنسی استحصال

اسلامی نقطہ نظر سے ان تمام صورتوں کے، انتہائی سنگین جرم ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور ان کا ارتکاب کرنے والوں کو جو قرار واقعی سزا ملنی چاہیے، اس کی تفصیلات فقہ وشریعت کے مباحث میں موجود ہیں۔ زیر نظر تحریر میں یہ کوشش کی جائے گی کہ قانونی وفقہی مباحث سے زیادہ تعرض کیے بغیر، علم نفسیات اور علم سماجیات کی روشنی میں اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ جرم کی یہ مختلف صورتیں کن حالات میں کن محرکات واسباب سے ظہور پذیر ہوتی ہیں اور ان کے سدباب کے لیے قانونی اقدامات کے علاوہ عمومی معاشرتی ماحول کی تطہیر اور افراد کی تربیت کے حوالے سے کن پہلوؤں پر توجہ دینا ضروری ہے۔

جنسی جارحیت کے عمومی محرکات

خواتین کی آبرو ریزی کا عمل مختلف واقعاتی سیاقات میں مختلف نوعیتیں رکھتا ہے اور اس کے محرکات ہمیشہ ایک جیسے نہیں ہوتے، اس لیے کس نوعیت کی آبروریزی کی روک تھام کے لیے

---

* مدیر ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ

کس طرح کے اقدامات موثر ہو سکتے ہیں، اس کا گہرا تجزیہ کیے بغیر اس باب میں کوئی ٹھوس پیش رفت نہیں کی جا سکتی۔

بنیادی طور پر آبروریزی کے چار بڑے محرکات مشاہدے میں آتے ہیں:

۱۔ دشمن گروہ سے تعلق رکھنے والی خواتین کی آبروریزی کو دشمن کی اجتماعی تذلیل اور ان کا مورال گرانے کے لیے بطور ہتھیار استعمال کرنے کا طریقہ جنگوں میں فتح یاب ہونے والی فوجیں اختیار کرتی آئی ہیں اور انسانی ضمیر کے اجماع اور بین الاقوامی قانون انسانیت جیسے ضابطوں کی موجودگی میں بھی اس نفسیات سے چھٹکارا پانا ابھی تک انسانوں کے لیے ممکن نہیں ہو پایا، جس پر حالیہ تمام جنگوں کے واقعات شاہد ہیں۔ ذرا نچلی سطح پر یہی نفسیات وڈیرہ شاہی کلچر میں ایسے واقعات میں کارفرما ہوتی ہے جس میں کسی کمی کمین کو اس کی اوقات بتانے کے لیے اس کے خاندان کی خواتین کو آبروریزی کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ایک اور سطح پر یہی نفسیات بعض افراد کو بھی اس پر آمادہ کر سکتی ہے کہ ذاتی رنجش کی وجہ سے کسی خاتون کو آبروریزی کا نشانہ بنا کر اپنے جذبہ انتقام کی تسکین کریں۔

۲۔ جنسی جبلت سے مغلوبیت کی کسی وقتی کیفیت کے تحت انفرادی سطح پر بھی اس طرح کے واقعات رونما ہو سکتے ہیں۔ اس کا نشانہ عموماً ماحول میں موجود کمزور اور غیر محفوظ خواتین بنتی ہیں؛ تاہم بعض صورتوں میں اس کی ابتدائی تحریک یا حوصلہ افزائی میں خود متاثرہ فریق (victim) کا بھی کردار ہو سکتا ہے۔ ناجائز اور خفیہ روابط کی صورت میں اس کے امکانات عموماً زیادہ ہوتے ہیں۔ اس محرک میں اہم نکتہ یہ ہے کہ مردانہ طاقت کے اظہار یا متاثرہ فریق کی تذلیل وغیرہ کا داعیہ بنیادی طور پر شامل نہیں ہوتا اور ضروری نہیں کہ اس کا ارتکاب کرنے والے بنیادی طور پر مجرمانہ ذہنیت کے حامل یا جرائم پیشہ لوگ ہوں۔

۳۔ جنسی جبلت سے مغلوبیت بعض خاص حالات میں perversion کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور مختلف نفسیاتی پیچیدگیوں کے زیر اثر بیمار ذہن کے افراد اس کی تسکین کے لیے بہت ہی پست

اور مجرمانہ طریقے اختیار کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کے ساتھ زیادتی کے بعد ان کو قتل کر دینا اور محارم کو آبروریزی کا نشانہ بنانا وغیرہ اس مجرمانہ نفسیات کے عمومی مظاہر ہیں۔

۴۔ جنسی جبلت جب مختلف عوامل سے انسان کو بالکل حیوانیت کی سطح پر لے آئے اور اس کے ساتھ مجرمانہ ذہنیت اور مردانہ طاقت کے اظہار کی نفسیات بھی شامل ہو جائے تو ایسے افراد یا گروہ ماحول میں اس طرح کے مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں اور ایسا ماحول ان کی جرأت کو خاص طور پر شہ دیتا ہے، جس میں نظام انصاف بہت کمزور اور الٹا طاقت ور کی مدد کرنے والا ہو۔

ان میں سے ہر سیاق، ایک مختلف نوعیت رکھتا ہے اور اس مخصوص نوعیت کو مد نظر رکھتے ہوئے ہی پیش بندی کی کوئی حکمت عملی زیر بحث لائی جا سکتی ہے۔

اسی طرح بچوں یا نوجوانوں کے جنسی استحصال کو سہولت اور معاونت فراہم کرنے والے ماحول کی مختلف خصوصیات کے تجزیے کے حوالے سے تین چار نکات بہت اہم ہیں:

۱۔ بچوں یا بچیوں کے جنسی استحصال کی بیماری کسی ایک طبقے تک محدود نہیں، بلکہ ایک وبا کی طرح پھیلی ہوئی معاشرتی بیماری ہے۔ تاہم اس کا ظہور بدیہی طور پر اس ماحول میں (مثلاً اقامتی دینی اداروں میں) زیادہ ہوتا ہے جہاں بچے، کلیتاً بڑوں کے رحم و کرم پر ہوں، غیر محتاط اختلاط کے مواقع بکثرت ہوں اور بچے گھر جیسی ضروری حفاظت سے بالکل محروم ہوں۔

۲۔ اس جرم کو ہلکا سمجھنے اور اس کے تسلسل کو قائم رکھنے میں بنیادی اور اہم ترین عامل، ماحول میں موجود یہ پیغام ہوتا ہے کہ یہ ہوتا آرہا ہے اور ہر جگہ ہو رہا ہے اور اس کو خاموشی اور پردہ پوشی کی مضبوط پناہ حاصل ہے۔

۳۔ جرم کی تحریک و ترغیب کے اسباب موجود اور مواخذہ کے امکانات معدوم ہونے کے باعث انسانی رشتوں کا تقدس ذہنوں میں بالکل دب جاتا ہے اور قریبی رشتہ دار تک اس جرم کے ارتکاب میں کوئی حجاب محسوس نہیں کرتے۔ ایسی صورت حال میں دینی اداروں کا نیکی اور تقوی

وطہارت کی تلقین پر مبنی ظاہری ماحول بھی کوئی موثر کردار ادا نہیں کر پاتا، بلکہ جبلی ونفسیاتی محرکات، تقوی وطہارت کی ظاہری تلقین پر غالب آجاتے ہیں۔

۴۔ ایک اہم تجزیہ طلب نقطہ نظر یہ بھی ہے کہ فطری جنسی داعیات کی موجودگی میں، صنفین کے تعامل اور اختلاط کے مواقع موجود نہ ہونے اور جنسی رغبت کو بالکل منفی انداز میں پیش کرنے کا معکوس اثر مرتب ہوتا ہے، یعنی اس سے جنسی تجسس اور رغبت بڑھ جاتی ہے اور اس کا رخ ماحول میں موجود آسان شکار یعنی بچوں کی طرف مڑ جاتا ہے۔

بچپن اور لڑکپن کی عمر کے تجربات، انسان کی نفسیاتی تشکیل میں فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہیں اور اس عمر میں اگر کسی معاشرے کی پوری نسل جنسی استحصال کی زد میں ہو تو اس کا تسلسل اگلی نسل میں بھی یقینی ہے، کیونکہ جو نسل جنسی استحصال کو ایک معمول کے عمل کے طور پر قبول کرتے ہوئے جوان ہوتی ہے، اس کے ہاتھوں اگلی نسل کے جنسی استحصال کو روکنا ممکن نہیں ہوتا۔ یوں جس طرح کورونا وائرس میں سماجی فاصلوں اور احتیاطی تدابیر سے انقطاع نہ پیدا کرنے سے اس کا پھیلاؤ بڑھتا رہتا ہے، اسی طرح بچوں کے جنسی استحصال کے حوالے سے ایک نسل کو لاحق موروثی اور اجتماعی مرض خودکار طریقے سے اگلی نسلوں کو منتقل ہوتا چلا جاتا ہے۔

خواتین اور بچوں کے علاوہ ایک اور طبقہ جو جنسی استحصال کا شکار ہے، لیکن وہ عموماً گفتگو کا موضوع نہیں بنتا، خواجہ سرا طبقہ ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایسے افراد کو خاندانی نظام سے نکال دیا جاتا ہے اور نتیجتاً انھیں اس پر مجبور کر دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی الگ کمیونٹی بنا کر زندگی گزاریں اور زمانے کے سرد وگرم کا سامنا کریں۔ یہ طبقہ گرو اور چیلے کی صورت میں ایک الگ سماجی پناہ گاہ بنا کر زندگی بسر کرتا اور سماج کا ایک حقارت زدہ اور دھتکارا ہوا طبقہ قرار پاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں جسم وجان کا رشتہ قائم رکھنے کے لیے یہ طبقہ سستی اور بے ہودہ تفریح مہیا کرنے، بھیک مانگنے اور جسم فروشی کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ پھر یہ سلسلہ صرف اس طبقے تک محدود نہیں

رہتا، بلکہ بڑی تعداد میں دوسرے افراد بھی خود کو مصنوعی طور پر خواجہ سرا بنا کر اس کمیونٹی کا حصہ بن جاتے ہیں۔

فکری بیانیوں کا کردار

جدید معاشرے میں اگر ان بیانیوں کا جائزہ لیا جائے جو خصوصاً خواتین کو غیر محفوظ بنانے میں کسی نہ کسی پہلو سے ایک کردار ادا کرتے ہیں تو ایک حیرت انگیز صورت حال سامنے آتی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ بظاہر دو بالکل مخالف فکری بیانیے خواتین کے حوالے سے ایک ہی طرح کا ذہنی رویہ پیدا کرنے میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔

ا۔ روایتی مذہبی بیانیہ

پہلے ہم روایتی مذہبی بیانیے پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

ایک امر واقعہ کے طور پر ہم جانتے ہیں کہ آبروریزی کا، ایک کثیر الوقوع جرم کی صورت اختیار کرنا جدید طرز معاشرت کے مظاہر میں سے ایک مظہر ہے اور اس کا براہ راست تعلق خواتین کے لیے "محفوظ" روایتی طرز معاشرت میں تبدیلیوں سے ہے۔ جدید طرز معاشرت نے خواتین کے لیے گھر کے ماحول سے باہر مختلف شعبہ ہائے زندگی میں حصہ لینے کے مواقع پیدا کیے ہیں اور اس کے نتیجے میں اختلاط پر مبنی ایک ایسی معاشرت تشکیل پذیر ہے جس میں ایسے حفاظتی انتظامات سر دست مستحکم نہیں ہیں جو گھر کے ماحول میں میسر حفاظت کا متبادل بن سکیں۔ معاشرت کے ایک سانچے سے دوسرے سانچے کی طرف انتقال کے مرحلے میں بنے ہوئے ذہنی رویوں کے لیے نئی صورت حال کے روبرو اپنا ردعمل طے کرنا ایک بہت مشکل اور کافی تکلیف دہ عمل ہوتا ہے۔ ہمارا صدیوں سے بنا ہوا نفسیاتی سانچا عورت کی عزت اور احترام کو گھر کی چار دیواری سے الگ نہیں دیکھ سکتا، اور اختلاط کے ماحول میں کام کرنے والی خواتین کے لیے "عزت واحترام" کا زاویہ نظر ہماری اس نفسیاتی تشکیل میں قابل قبول نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں، ہمارے روایتی معاشرت سے تشکیل پانے والے ذہنی رویوں اور جدید طرز معاشرت میں ایک dissonance (مغایرت) ہے

جو صرف غیر شعوری نہیں ہے، بلکہ ہمارے ہاں رائج مختلف فکری بیانیوں میں اس کا باقاعدہ اظہار ہوتا ہے۔

ہمارا اجتماعی نفسیاتی سانچا، مخلوط ماحول میں کام کرنے والی خواتین کے ساتھ عزت واحترام کے تصور کو وابستہ کرنے میں شدید دقت محسوس کرتا ہے۔ اس میں ایک تنقیح بات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے؛ ایسا نہیں کہ گھر سے باہر یا مخلوط ماحول میں عورت کی موجودگی فی نفسہ اس نفسیاتی سانچے میں قابل قبول نہیں یا عورت کے احترام کے احساس کو زائل کر دیتی ہے۔ تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق اس سے ہے کہ عورت کس "حیثیت" سے مخلوط ماحول میں موجود ہے۔ ایک گھریلو خاتون کی حیثیت سے عورت کو اب بھی پبلک مقامات پر احترام دیا جاتا ہے اور اس کے مظاہر ہم دفاتر، بنکوں، پبلک ٹرانسپورٹ، اسپتالوں وغیرہ میں ہر جگہ دیکھ سکتے ہیں۔ اس لیے معاشرے کا مسئلہ خواتین کے لیے عزت واحترام کے تصور کے فقدان کا نہیں، بلکہ اس کے معیارات کا ہے۔ عورت کے باکردار اور مستحق احترام ہونے کا تصور ہمارے نفسیاتی سانچے میں گھریلو خاتون کے ساتھ جڑا ہوا ہے اور اس حیثیت میں ایک معاشرتی قدر کے طور پر خواتین کو ہر جگہ احترام دیا جاتا ہے۔ لیکن جیسے ہی خواتین کو "ورکنگ ویمن" کی حیثیت میں یا اس کی اہلیت پیدا کرنے کی سعی کرتے ہوئے (مثلاً تعلیمی اداروں میں) تصور کیا جاتا ہے تو سماج کا نفسیاتی سانچا ایسی خواتین کو بنظر احترام دیکھنے پر خود کو آمادہ نہیں پاتا۔ غالب زاویہ نظر ایسی خواتین کے کردار کو منفی زاویے سے اور حسب موقع، نظر بازی یا جنسی پیش قدمی کے ایک ممکنہ ہدف کے طور پر دیکھنے کا ہوتا ہے۔

اس غیر شعوری نفسیاتی احساس کو فکری جواز اور تائید فراہم کرنے کا کام وہ بیانیے کرتے ہیں جو جدید طرز معاشرت میں اختلاط کے مواقع کو فی نفسہ ایک برائی کے طور پر پیش کرتے ہیں اور ان بیانیوں میں سب سے زیادہ بلند آہنگ بیانیہ، مذہبی طبقوں کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے؛ جو ایک مخصوص برقع پوش معاشرت کو دینی واخلاقی اقدار کے معیاری نمونے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

انھیں اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ اس سے جدید طرز معاشرت میں خواتین کے ایک بہت بڑے طبقے کے لیے، جو تدریجاً اکثریت میں تبدیل ہوتا جارہا ہے، کس نوعیت کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ جبکہ ضرورت اس امر کی تھی جدید تمدن کے اوضاع کے لحاظ سے، خواتین کی عزت واحترام کا ایک مذہبی بیانیہ تشکیل دیا جائے جس سے نئی طرز معاشرت میں اجتماعی نفسیاتی احساسات میں مطلوبہ تبدیلیاں پیدا کرنے میں مدد ملتی ہو۔

مخلوط ماحول میں خواتین کی سماجی سرگرمیوں پر مذہبی یا معاشرتی اقدار کے لحاظ سے منفی حکم لگانے والے بیانیوں کے ذکر کا مطلب یہ نہیں کہ وہ براہ راست جنسی ہراسانی یا جنسی درندگی جیسے رجحانات کے ذمہ دار ہیں۔ اسی طرح بدیہی طور پر اس تجزیے سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بھی درست نہیں ہوگا کہ ان رویوں کا نشانہ صرف مخلوط ماحول میں کام کرنے والی خواتین بنتی ہیں۔ زیر بحث بیانیوں کا کردار ان رویوں کے فروغ میں بالواسطہ ہے، یعنی مخلوط ماحول میں کام کرنے والی خواتین کے بارے میں یہ بیانیے ایسی سماجی نفسیات کو تقویت پہنچاتے ہیں جس میں انھیں احترام اور تقدس کی نظر سے دیکھنے کے بجائے جنسی تلذذ کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ چیز پھر دیگر کئی عوامل کے ساتھ مل کر جنسی درندگی جیسے مجرمانہ رجحانات کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور چونکہ یہ رجحانات شعوری نہیں ہوتے، یعنی ایسا نہیں ہوتا کہ مجرم باقاعدہ سوچ سمجھ کر مخلوط ماحول میں کام کرنے والی خواتین کو نشانہ بنانے کا فیصلہ کریں، بلکہ دراصل کئی نفسیاتی عوامل کے اشتراک سے ایسے افراد میں فی نفسہ خواتین کے تقدس اور احترام کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے، اس لیے نتیجے کے طور پر ان مجرمانہ حملوں کا ہدف صرف مخلوط ماحول کا حصہ بننے والی خواتین نہیں رہتیں، بلکہ ہر طرح کی خواتین ان کی زد میں آجاتی ہیں۔

۲۔ جدید لبرل بیانیہ

سماجی آزادیوں اور انفرادی حقوق واختیارات کے حوالے سے جدید لبرل بیانیہ اور جدید طرز معاشرت ایک دوسرے انداز سے خواتین کے متعلق اس زاویہ نظر کو تقویت پہنچاتے ہیں

جس کا نتیجہ جنسی تشدد کی صورت میں نکلتا ہے۔ اس ضمن میں دو عوامل کو براہ راست جنسی درندگی یا جنسی ہراسانی جیسے مظاہر کا ذمہ دار قرار دیا جاسکتا ہے:

سب سے پہلا اور بنیادی عامل، سرمایہ دارانہ معیشت کی اخلاقیات ہے جو نسوانی حسن اور جنسی جذبات کی انگیخت کو ایک باقاعدہ فروختنی چیز تصور کرتی اور ان کی مارکیٹنگ کے لیے مذہب واخلاق اور انسانی معاشرے کی صلاح وفلاح کو بالکل بالائے طاق رکھتے ہوئے ہر قسم کے کاروباری طریقے اختیار کرنے کو جائز قرار دیتی ہے۔ اس کی بدترین شکل عریاں فلموں کی صنعت کی صورت میں سامنے آتی ہے، جس سے بڑھ کر نسوانی تذلیل اور توہین کی کوئی شکل انسانی تاریخ نے نہیں دیکھی ہوگی، لیکن مغربی معاشروں میں اسے باقاعدہ قانونی تحفظ حاصل ہے۔ تاہم اس سے نچلی سطحوں پر نیم عریانی سمیت جنسی جذبات کو بے قید کرنے کے جو متنوع طریقے اختیار کیے جاتے ہیں اور جنھیں بتدریج مشرقی معاشروں میں بھی قبولیت حاصل ہوتی جارہی ہے، ان کا کردار خواتین کے متعلق مجرمانہ جنسی نفسیات پیدا کرنے میں کسی طرح بھی نظرانداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔

دوسرا بنیادی عامل، اختلاط کے ماحول میں ان آداب وحدود کی پابندی کو اہمیت نہ دینے، بلکہ آزادیِ نسواں کے عنوان سے ان کی پامالی کا پرزور دفاع کرنے کا رویہ ہے جن کی تعلیم نہ صرف مذہب اور اخلاق دیتے ہیں، بلکہ انسانی نفسیات کے آزمودہ اصول بھی ان کی تائید کرتے ہیں۔ مذہب واخلاق، خواتین کے تحفظ کے مسئلے کو حیا اور پاک دامنی کی قدروں سے الگ کرکے نہیں دیکھتے اور یک طرفہ طور پر صرف مردوں کو "احترام خواتین" کا پابند نہیں کرتے، بلکہ خواتین کو بھی ان اخلاقی حدود وآداب کا پابند بنانا چاہتے ہیں جن کا نتیجہ خواتین کے تحفظ کی صورت میں نکلتا ہے۔ اس کے برعکس حقوق نسواں کا عصری فلسفہ اس معاملے میں عورت کی انفرادیت اور آزادی کو تو اہمیت دیتا ہے جس کی رو سے عورت کو پورا حق ہے کہ وہ جیسا چاہے، لباس پہنے اور اپنے نسوانی حسن کی داد یا صنف مخالف کی توجہ حاصل کرنے کے لیے جو انداز چاہے، اختیار کرے، لیکن

اس کے نتیجے میں مخالف صنف میں جس طرح کے جنسی رجحانات اور رویوں کا فروغ پانا لازم ہے، ان سے کلی طور پر صرف نظر کر لیا جاتا ہے۔

اسلام کی معاشرتی تعلیمات میں بالکل اسی اصول پر مرد وزن کے اختلاط کے حدود وآداب مقرر کیے گئے ہیں، جو اس بنیادی حکم پر مبنی ہیں کہ شادی کے رشتے کے باہر مرد وعورت کا جنسی تعلق ممنوع ہے۔ اسلام اور موجودہ غالب تہذیب کا اصل اختلاف اسی بنیادی موقف میں ہے، اور مرد وزن کے اختلاط کی امتناعی تدابیر کے حوالے سے اختلاف اس بنیادی اختلاف پر متفرع ہے۔ تہذیب حاضر کے موقف کے مطابق چونکہ آزاد جنسی تعلق، انفرادی آزادیوں میں شامل ہے جس پر کوئی قدغن نہیں لگائی جا سکتی، اس لیے اس کی تجویز کردہ امتناعی تدابیر صرف جبر اور اکراہ کو موضوع بناتی ہیں۔ اسلام کا موقف یہ ہے کہ آزاد جنسی تعلق فی نفسہ ممنوع ہے، اس لیے ان تمام ذرائع، محرکات اور وسائل کا سدباب بھی ضروری ہے جو اس کی راہ ہموار کرتے ہوں۔

۳۔ جنسی تشدد کے مجرموں کی سزا

خواتین کے سماجی مقام اور کردار اور سماجی آزادیوں کے حدود کے سوال کے ساتھ ساتھ ایک اور بحث جو معاشرتی رویوں کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہے، وہ جنسی جارحیت کی نوعیت اور اس کی سزا سے متعلق پائے جانے والے زاویہ ہائے نظر ہیں۔ یہاں بھی حیرت انگیز طور پر ہمیں روایتی مذہبی وفقہی انداز فکر اور ہیومنزم کے فلسفے سے متاثر جدید اخلاقی تصورات میں بعض ایسی مماثلتیں دکھائی دیتی ہیں جو معاشرتی نفسیات اور قانونی فکر میں جنسی جارحیت کی سنگینی کے کماحقہ ادراک میں رکاوٹ بنتی ہیں۔

روایتی فقہی مذاہب میں زنا بالجبر کو زنا بالرضا کے مقابلے میں سنگین تر جنایت تسلیم کرنے کے باوجود بالعموم اس کے مرتکب کے لیے زنا کی عام سزا ہی تجویز کی گئی ہے یا زیادہ سے زیادہ زیادتی کا شکار ہونے والی عورت کو اس کے مہر کے برابر رقم کا حق دار قرار دیا گیا ہے، جبکہ بعض

فقہا متاثرہ خاتون کو اس رقم کا مستحق بھی نہیں سمجھتے۔[۱] امام مالک سے منقول ہے کہ اس صورت میں عورت کو مہر کے ساتھ اس کی عزت وناموس اور حیثیت عرفی کے مجروح ہونے کا تاوان بھی دلوایا جائے گا۔[۲]

اس انداز فکر کی مشکل یہ ہے کہ اس میں زنا بالجبر کو زنا کی دو صورتوں میں سے ایک صورت کے طور پر دیکھا جاتا ہے، جبکہ حقیقت کے لحاظ سے زنا بالجبر ایک بالکل مختلف نوعیت کا جرم ہے۔ رضامندی کا زنا اصلاً ایک گناہ ہے جس میں 'حق اللہ' پامال ہوتا ہے، جبکہ زنا بالجبر میں حق اللہ کے ساتھ ساتھ حق العبد پر بھی تعدّی کی جاتی ہے اور ایک خاتون سے اس کی سب سے قیمتی متاع چھین لی جاتی ہے۔ ایک پاک دامن عورت کے لیے جو اپنی عفت اور اپنی عزت نفس کو عزیز رکھتی ہے، عصمت کا لوٹا جانا کوئی مالی نقصان نہیں کہ اس کے بدلے میں اسے کچھ رقم دے کر نقصان کی تلافی کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کا شکار ہونے والی خاتون کے زاویہ نظر سے دیکھیے تو نفسیاتی لحاظ سے یہ غالباً قتل سے بھی بڑا جرم ہے اور ابن تیمیہ نے بجا طور پر اسے 'مثلہ' (Mutilation)، یعنی انسانی جسم کی بے حرمتی کے مشابہ قرار دیا ہے۔[۳]

بروکلین لا اسکول میں قانون کی استاد پروفیسر سوزن این ہرمن (Susan N. Herman) نے اس ضمن میں نفسیاتی تحقیقات کا خلاصہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

Women who are raped suffer a sense of violation that goes beyond physical injury. They may become distrustful of men and experience feelings of shame, humiliation, and loss of privacy. Victims who suffer rape trauma syndrome experience physical symptoms such as headaches, sleep disturbances, and fatigue. They may also develop psychological disturbances related to the circumstances of the rape, such as intense fears. Fear

---

۱۔ موطا الامام مالک، رقم ۲۲۹۴۔ الشافعی، الام ۳/ ۲۷۲۔ سرخسی، المبسوط ۹/ ۶۱- ۶۲

۲۔ سحنون بن سعید، المدونۃ الکبریٰ ۱۶/ ۲۵۴

۳۔ ابن تیمیہ، مجموع الفتاویٰ ۲۰/ ۵۶۶

of being raped has social as well as personal consequences. For example, it may prevent women from socializing or traveling as they wish".[1]

زنا بالجبر کا شکار ہونے والی خواتین پامالی کے ایک احساس کا شکار ہو جاتی ہیں جو جسمانی اذیت سے کہیں زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ اس کا امکان ہے کہ وہ مردوں پر اعتبار کھو بیٹھیں اور انھیں شرمندگی، تذلیل اور بے پردگی کے احساسات کا تجربہ ہوتا رہے۔ اس کا شکار ہونے والی جو خواتین 'Rape trauma syndrome' (زیادتی کے نفسیاتی دھچکے سے پیدا ہونے والی علامات) کا شکار ہو جاتی ہیں، ان میں سر درد، نیند میں خلل اور تھکن کی جسمانی علامات بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان میں زیادتی کے حالات سے تعلق رکھنے والے نفسیاتی عدم توازن مثلاً شدید خوف کا پیدا ہو جانا بھی بعید نہیں۔ زیادتی کا شکار ہونے کا خوف سماجی کے ساتھ ساتھ ذاتی نوعیت کے نتائج مرتب کرتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ خواتین کے سماجی میل جول یا اپنی مرضی سے سفر کرنے میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔

مزید یہ کہ زیادتی کا شکار ہونے والی عورت کے 'نقصان' کو پورا کرنا اور چیز ہے اور جرم کی سنگینی کے تناظر میں مجرم کی جسمانی سزا میں اضافہ ایک بالکل دوسری چیز اور عورت کو عصمت دری کا معاوضہ دلانے کے باوجود اگر مجرم کو کوئی اضافی جسمانی سزا نہیں دی جاتی تو اس سے عدل و انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔

یہ اسی انداز فکر کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۹۷ء میں جب پاکستان کی قومی اسمبلی نے اجتماعی آبروریزی (Gang Rape) پر سزاے موت کا قانون منظور کیا تو بعض مذہبی حلقوں نے اس قانون کو غیر شرعی قرار دیتے ہوئے اس کی مخالفت کی؛ تاہم مولانا ابو عمار زاہد الراشدی نے اس موقف سے اختلاف کرتے ہوئے بجا طور پر لکھا:

1. Microsoft Encarta Reference Library 2003, CD edition, article: "Rape"

ایک ہی جرم مختلف مواقع اور حالات کے حوالے سے الگ الگ نوعیت اختیار کر لیتا ہے اور جرم کی مختلف نوعیتوں کا یہ فرق علماے احناف کے ہاں تو بطور خاص تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس اصول کی روشنی میں دیکھا جائے تو "گینگ ریپ" زنا کی عام تعریف سے ہٹ کر ایک الگ، بلکہ اس سے زیادہ سنگین جرم قرار پاتا ہے، اس لیے کہ اجتماعی بدکاری کی صورت میں زنا کے ساتھ دو مزید جرم بھی شامل ہو جاتے ہیں: ایک یہ کہ یہ بدکاری عملاً دوسرے لوگوں کے سامنے کی جاتی ہے جس میں تذلیل اور تشہیر کا پہلو پایا جاتا ہے اور انتقام کے لیے خود ساختہ صورت اختیار کرنا بجاے خود جرم ہے۔ پھر اس موقع پر اگر ہتھیار کی موجودگی اور نمایش بھی کی گئی ہو تو تخویف اور جبر کا ایک تیسرا جرم بھی اس کے ساتھ بڑھ جاتا ہے اور ان تمام جرائم کا مجموعہ "گینگ ریپ" ہے جس کے بڑھتے ہوئے رجحان پر قابو پانے کے لیے اگر "حدود شرعیہ" سے ہٹ کر بطور تعزیر الگ سزا مقرر کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے تو اسے شرعی اصولوں سے تجاوز قرار دینا کوئی مناسب طرز عمل نہیں ہو گا۔ ہمارا خیال ہے کہ "گینگ ریپ" کی انسانیت سوز وارداتوں میں جس طرح مسلسل اضافہ ہو رہا ہے، اس پر قابو پانے کے لیے موت کی سزا کا یہ قانون ایک مناسب، بلکہ ضروری قانون ہے اور شرعاً اس میں کوئی مضایقہ نہیں ہے۔[1]

اسی نوعیت کی بے اعتدالی جرم و سزا سے متعلق جدید مغربی تصورات میں بھی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک برطانوی مصنفہ Joanna Bourke نے اپنی کتاب Rape: A history from 1860 to the present میں ایک طرف یہ بیان کیا ہے کہ اعداد و شمار کے مطابق برطانیہ میں زنا بالجبر کے رپورٹ ہونے والے واقعات میں سے صرف پانچ فیصد مقدمات میں مجرم کیفر کردار کو پہنچتا ہے اور یہی امر مصنفہ کے لیے اس کتاب کی تصنیف کا محرک بنا ہے، لیکن جب اس کے

۱۔ ابو عمار زاہد الراشدی، عصر حاضر میں اجتہاد ۱۸۶-۱۸۴

سدباب کی بات آتی ہے تو مصنفہ تجویز کرتی ہے کہ ایسے مجرموں کو کوئی سخت سزا دینے کے بجائے دواؤں اور نفسیاتی بحالی کے طریقوں سے ان کا علاج کیا جائے۔[1]

مغربی مفکرین اخلاقیات اور انسانی فطرت کے محدود اور ناقص فہم کے تحت اس بات کو سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں کہ کسی انسان کی جان و مال اور عزت و آبرو اسی وقت تک احترام اور تحفظ کی مستحق ہے، جب تک وہ قانونی اور اخلاقی حدود کو پامال نہ کرے۔ نیز یہ کہ جرم ضروری نہیں کہ ہمیشہ کسی نفسیاتی عدم توازن کا نتیجہ ہو اور مجرم کو اپنے ارادہ واختیار کے سوءِ استعمال کا قصوروار نہ ٹھہرایا جاسکے۔ انسان کی فطرت میں شر کا ایک قوی عنصر موجود ہے جس کے زیر اثر وہ دانستہ دوسرے انسانوں کے حقوق پر تعدّی کا راستہ اختیار کرتا ہے اور اس کے لیے اسے اخلاقی طور پر پوری طرح ذمہ دار ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی اہل مغرب کی نگاہوں سے اوجھل رہ گئی ہے کہ معاشرتی جرائم پر موثر طریقے سے قابو پانا سخت اور سنگین سزاؤں ہی کی مدد سے ممکن ہے، جبکہ انسانی حقوق کے اس فلسفے کے زیر اثر جرم و سزا کے باب میں مجرم کے ساتھ ہمدردی کا ایک نہایت غیر متوازن رویہ اپنا کر مغربی فکر ایک عجیب تضاد کا شکار ہو گئی ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے، یہ انداز فکر نہ انسانی فطرت کے صحیح فہم کی عکاسی کرتا ہے، نہ اس سے عدل وانصاف کے تقاضے پورے ہوتے ہیں اور نہ جرائم کی روک تھام میں ہی اس سے کوئی مدد مل سکتی ہے۔

سدباب کی حکمت عملی

آبروریزی کے رجحان کا تجزیہ جب نفسیاتی و سماجی عوامل کی روشنی میں کرنے کی بات کی جاتی ہے تو اس کا اہم ترین مقصد اس پہلو کی طرف توجہ دلانا ہوتا ہے کہ ریاستی طاقت اور قانون کا کردار اس معاملے میں بہت بنیادی ہونے کے باوجود اسے مسئلے کے حل کی شاہ کلید نہیں سمجھا جاسکتا۔ انسانی بساط کی حد تک مسئلے کے حل کی تدبیر کے لیے ضروری ہے کہ جرم کی نفسیات کو پیدا کرنے یا فروغ دینے والے عوامل کے سدباب، اور جرم کے وقوع کے بعد ریاستی طاقت کے کردار، دونوں

1. Daily Dawn, Books and Authors, January 13, 2008, page 1

کے مابین ایک متوازن تعلق وجود میں لایا جائے، یعنی جرم پر مناسب تعزیری اقدامات کو یقینی بنانے کے ساتھ ساتھ جرم کی پیش بندی پر بھی اتنی ہی توجہ دی جائے۔

جرم کو اگر آوارہ کتے کے کاٹنے کی مثال سے سمجھا جائے تو جرم پر قابو پانے کا یہ طریقہ کبھی موثر نہیں ہو سکتا کہ شہری آبادیوں میں آوارہ کتوں کے پھیلتے چلے جانے پر تو کوئی توجہ نہ دی جائے اور سارا زور اس پر صرف کیا جائے کہ اگر کتا کسی کو کاٹ لے تو سگ گزیدہ کی اشک شوئی کے لیے ہر ڈسپنسری اور اسپتال میں انجکشن وافر تعداد میں میسر ہوں اور میونسپل کمیٹی کے کارندے فوری طور پر ایسے کتے کے خلاف ایکشن لینے کے لیے مستعد ہوں۔ ان ضروری اقدامات سے پہلے آوارہ کتوں کی افزائش نسل پر قدغن لگانے کی اہمیت اس سے کہیں زیادہ ہے، اور یہ صرف ریاستی اداروں کی ذمہ داری نہیں، بلکہ شہری آبادی اور حکومتی اداروں کے باہمی تعاون کے ساتھ اجتماعی طور پر انجام دی جانے والی ایک ذمہ داری بنتی ہے۔

اس بنیادی تناظر میں اگر آبروریزی کی مختلف صورتوں کا تجزیہ کیا جائے تو پہلی صورت میں بنیادی کردار ریاستی طاقت اور قانون کا بنتا ہے، کیونکہ اس کے وجود میں آنے کا اصل محرک اندھی طاقت اور اس کا اظہار ہوتا ہے اور طاقت کے نشے کو طاقت کے تریاق سے ہی توڑا جا سکتا ہے۔ تاہم باقی تین صورتوں میں معاشرتی سانچوں، عمومی ذہنی رویوں، مذہبی و غیر مذہبی فکری بیانیوں، نفسی واخلاقی تربیت کے معاشرتی انتظامات اور خاص طور پر سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی اخلاقیات کو زیر بحث لائے بغیر آوارہ کتوں کی افزائش نسل پر قدغن لگانے کی کوئی بامعنی حکمت عملی نہیں سوچی جا سکتی۔

اس سلسلے میں اہم ترین نکتہ جو ذہن نشین رہنا چاہیے، یہ ہے کہ مرد کا جارحانہ جنسی جبلت کا حامل ہونا ایک حیاتیاتی حقیقت ہے اور اسے مسئلے کی اساس کی حیثیت حاصل ہے۔ ظاہر ہے، اسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا، البتہ اسے حدود کا پابند بنانے کی تدبیر کی جا سکتی ہے۔ تدبیر کے دو تین پہلو ہیں اور سبھی بے حد اہم ہیں۔

ایک، شعور اور اخلاق کی تربیت کے ذریعے سے افراد میں انسانی ہمدردی اور خاص طور پر صنف بہتر کے احترام کے جذبات کی آبیاری کرنا اور انھیں معاشرتی اقدار کے طور پر رائج کرنا۔

دوسرا، جنسی جبلت کی تسکین کو جائز اخلاقی حدود میں آسان سے آسان تر بنانا اور بے جا معاشرتی قدغنوں اور رکاوٹوں کو دور کرنا۔ اور تیسرا، حدود سے تجاوز پر محاسبہ اور سزا کے خوف کو موثر بنانا۔

اس میں کلیدی اہمیت صنف بہتر کے بارے میں مردوں کے نفسیاتی احساسات کو حاصل ہے اور ان کی تشکیل میں فیصلہ کن کردار معاشرتی سانچوں اور فکری بیانیوں کا ہوتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں، جنسی ہراسانی کا تعلق صرف مرد کی جارحیت سے نہیں ہے، اس کو تقویت دینے والے اسباب میں بنیادی کردار عورت سے متعلق اس عمومی ذہنی واخلاقی تصور کا ہے جو کسی معاشرے میں پایا جاتا ہے۔ اگر عمومی معاشرتی ماحول اور اس میں ذہنی واخلاقی تربیت کے ذرائع عورت کے متعلق احترام، ہمدردی اور تحفظ کا رویہ پیدا کریں گے (جس کے لیے مرد وزن کے اختلاط اور نسوانی حسن کی نمائش کے حدود وآداب کی اہمیت بنیادی ہے) تو اس کے نتائج اور ہوں گے، لیکن اس پہلو کو نظر انداز کیا جائے گا تو ایسے ماحول میں جنسی ہراسانی اور خواتین کے عدم تحفظ جیسے مسائل مستقل طور پر حل طلب رہیں گے۔

مرد وزن کے اختلاط کے حوالے سے عمومی اخلاقی تربیت اور رویہ سازی میں اس نکتے کو بنیادی اہمیت دی جانی چاہیے کہ مخلوط ماحول میں کام کرنے والی خواتین کے لیے عزت واحترام، ہمدردی اور ترحم کے جذبات بیدار کیے جائیں۔ جدید طرز معاشرت نے خواتین کو بھی معاشی ذمہ داریوں میں شریک کر دیا ہے اور انھیں اپنے خاندان کا سہارا بننے کے لیے کئی طرح کی پر مشقت معاشی سرگرمیوں میں حصہ لینا پڑتا ہے۔ ایسے ماحول میں انھیں جنسی تلذذ کا ذریعہ تصور کرنے والی نفسیات سے خواتین کی صورت حال کا یہ پہلو اوجھل ہوتا ہے اور وہ اس جبر کو محسوس کیے بغیر جس کا خواتین کو سامنا ہے، خود غرضی اور نفس پرستی کی کیفیت میں انھیں صرف صنف مخالف

کی نظر سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ چنانچہ بار بار کی تذکیر سے لوگوں کی اخلاقی حس کو بیدار کرنے کا اہتمام کرنے اور خواتین کے حوالے سے کلچرل زاویہ نظر کی تشکیل میں احترام، ترحم اور ہمدردی جیسے جذبات کو بنیادی عناصر کے طور پر شامل کرنے کی ضرورت ہے۔

جہاں تک جنسی جبلت کی تسکین کے مواقع کو اخلاقی و شرعی حدود میں آسان بنانے کا تعلق ہے تو اس کے لیے اہل علم کو اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ہمارے معاشرے میں شادی کے ساتھ جو کئی طرح کی سماجی رسوم اور تقاضے شامل ہو گئے ہیں، وہ اس اہم معاشرتی ادارے کے مقاصد اور اہداف کو پورا کرنے کے بجائے عملاً اس میں ایک بڑی رکاوٹ بن چکے ہیں۔ نکاح کو آسان بنانے کے لیے ایک بڑی سطح کے معاشرتی جہاد کی ضرورت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ سماجی حالات اور پیچیدگیوں کا جبر یہ تقاضا بھی کر رہا ہے کہ بدکاری اور عمر بھر کے عقد نکاح کے درمیان عارضی نکاح کی ایک صورت نکالی جائے جس کی گنجائش اسلامی فقہ میں موجود ہے۔[1] ایک طرف روز افزوں جنسی ترغیبات اور دوسری طرف شادی میں گوناگوں مشکلات کا جو طوفان مسلم معاشروں پر یلغار کر رہا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے جلد اہل علم وفقہ کو اس طرف متوجہ ہونا پڑے گا، ایسے ہی جیسے عرب معاشروں میں سماجی ضرورتوں کے تحت "مسیار" جیسے طریقوں کو شرعی و قانونی جواز دینا پڑا ہے۔

متاثرین جرم کی نفسیاتی وجسمانی بحالی

جنسی درندگی کے رجحان کے سدباب کے لیے جہاں معاشرے میں خواتین کی توقیر واحترام کو بطور قدر فروغ دینے اور بے توقیری کا رویہ پیدا کرنے والے جملہ اسباب کی سخت حوصلہ شکنی کی ضرورت ہے، وہاں تعلیم وتربیت کے تمام ذرائع کو بروئے کار لاتے ہوئے انتہائی ترجیحی بنیادوں پر افراد کی نفسی واخلاقی تربیت کو بھی ایک مہم کی صورت میں جاری کرنا ضروری

۱۔ تفصیل کے لیے اس موضوع پر ہماری تحریر اس لنک پر دیکھی جا سکتی ہے: بوقت ضرورت عارضی نکاح کے جواز کا مسئلہ - مکالمہ (mukaalma.com)

ہے۔ اس ضمن میں ذہنی رویوں کی تطہیر کے لیے مذہبی وعظ و نصیحت اور انسانی و نسوانی ہمدردی کی تلقین و تعلیم کے پہلو بہ پہلو علم نفسیات کی مدد سے لوگوں میں یہ آگاہی پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ ماحول میں موجود جنسی ترغیبات کس طرح ان کے معمول کے ذہنی رویوں پر اثر انداز ہوتی اور ان کی شخصیت کو آلودہ و پراگندہ کرنے کا موجب بنتی ہیں اور یہ کہ کن مختلف تدابیر سے کام لیتے ہوئے وہ ان کے مضر اثرات سے خود کو زیادہ سے زیادہ محفوظ بنا سکتے ہیں۔

نفسیاتی علاج معالجے کی سہولت جو ہمارے معاشرے میں اب تک انفرادی سطح پر اور بہت محدود دائرے میں دستیاب ہے، اسے ذرائع ابلاغ کے ذریعے سے تعلیم عامہ کے پروگراموں میں بدلنے کی ضرورت ہے۔ جدید طرز معاشرت نے انسانوں کو جن ان گنت نفسیاتی عوارض سے دوچار کر دیا ہے، ان کا موثر علاج نفسی و اخلاقی تربیت کے ایک عمومی ماحول سے ہی ممکن ہے۔ ریاست اور قانون اس باب میں ایک خاص حد تک ہی مددگار ہو سکتے ہیں، ان سے اس سے زیادہ کی توقع کرنا غیر حقیقت پسندانہ انداز فکر ہو گا۔

سوال و جواب

ڈاکٹر محمد طاہر منصوری: محترم عمار خان ناصر صاحب نے اسلامی تناظر کے حوالے سے بڑی اصولی بات کی ہے کہ سب سے پہلے قرآن و سنت کی نصوص، اس کے بعد قیاس و مصلحت، اور پھر شریعت کا عمومی مزاج و مذاق اور مقاصد شریعت ہے۔ تاہم اس کے علاوہ بہت سے مسائل میں جہاں فقہ کا دائرہ محدود ہو جاتا ہے اور اس کو ہمیں سیاست شرعیہ کے ساتھ جوڑنا چاہیے۔ میں یہاں پر ایک بات کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ سیاست شرعیہ شریعت کے عمومی مزاج، مصلحت مرسلہ، مقاصد شریعت سے ہٹ کر کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ اسی کے ساتھ بالکل مربوط ہے۔ سیاست شرعیہ کی اصطلاح جو اگرچہ فقہا کے ہاں بعد میں مروّج ہوئی، لیکن یہ درحقیقت قرآن و سنت کی نصوص، قیاس و مصلحت یا مقاصد شریعت کے ساتھ ہی اس کی تعبیر و تشریح کے اصول

ہیں۔ البتہ اس کی عملی تطبیق کے حوالے سے ہمارے ہاں یہ مسئلہ ہے کہ ربڑ کی طرح جیسے چاہیں سیاست شریعہ کو کھینچ لیں۔ یہ ایک مشکل پیش آ جاتی ہے اور اکثر اوقات اولوا الامر نے سیاسہ شرعیہ کو اپنے ذاتی مقاصد و مصالح کے لیے استعمال کیا۔ آج کل بھی یہی ہو رہا ہے کہ جس چیز کو حکمران نافذ کرنا چاہتے ہیں، اسے ملک و قوم کا وسیع تر مفاد قرار دے دیتے ہیں۔ اسی لیے مجتہد اور فقیہ کی ضرورت یہاں پر بھی ہے کہ سیاست شرعیہ کو کیسے منضبط کریں۔ اعتدال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا چاہیے کہ فقہ کا دائرہ ختم نہیں ہوا، بلکہ اس کا دائرہ ان سب کو محیط ہے اور سیاست شرعیہ بھی اسی دائرے کے اندر داخل ہے۔

ڈاکٹر فرخندہ ضیاء: میں ایک چھوٹی سی بات کا اضافہ کروں گی کہ اگر سیاست شرعیہ کی اصطلاح پر ہی غور کر لیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ یہ شریعت کے دائرہ سے باہر نہیں، فقہ کے اصولوں سے باہر نہیں۔ لہٰذا یہ اس سے علاحدہ نہیں ہے، یہیں سے ساری بات واضح ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر طفیل ہاشمی: ڈاکٹر عمار خان ناصر نے جو پیراڈائم بنانے کی کوشش کی، اس پر مجھے تھوڑی بات کرنی ہے۔ ایک یہ کہ اس کی جو اساس انہوں نے بیان کی ہے کہ حکمران طبقہ کسی چیز کو وسیع تر مفاد میں بہتر یا غلط سمجھتا ہے اور اس کے بارے میں کسی شرعی اتھارٹی کے بغیر قانون سازی کرتا ہے۔ جبکہ قرآن حکیم نے اس کی اپنی بالکل ابتدا سے ہی مذمت کی ہے کہ ﴿إن تنازعتم في شيء فردّوه إلى...﴾ الخ۔ حکمرانوں کو یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ اسلام کے لیگل پیراڈائم سے ہٹ کر قانون سازی کریں اور اس کو لوگوں پر نافذ کریں۔

خلفائے راشدین کی جو مثالیں دی جاتی ہیں، ان میں کچھ مثالیں تو شاید ایسی بھی ہیں کہ قانونی دماغ نے ان کو قبول نہیں کیا اور اگر اس کو بے ادبی پر محمول نہ کیا جائے تو میں یہ عرض کروں کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کا پہلا فیصلہ جو انہوں نے مانعین زکاۃ کو مرتدین کے ساتھ شامل کر کے ان کے خلاف ایکشن لینے کا کیا تھا، حضرت عمرؓ نے اس کو قبول نہیں کیا۔ یہ بات درست ہے کہ وہ اس حد تک نہیں گئے کہ وہ اس کے خلاف کھڑے ہوتے البتہ جب ان کا اپنا دور آیا تو انہوں نے

اس سارے فیصلے کو ریورس کر کے تمام قیدیوں اور باندیوں کو آزاد کر کے اپنے گھروں اور قبیلوں میں واپس بھیج دیا۔ اسی طرح حضرت ابو بکرؓ کا فیصلہ کہ لوگوں کے وظائف یعنی ان کی تنخواہیں برابر رکھی جائیں، حضرت عمرؓ نے اس کو بھی کالعدم کر دیا۔ امام شافعی نے اس پر بہت تفصیل سے گفتگو کی ہے کہ خلافت راشدہ میں جو اس طرح کے فیصلے ہوئے ہیں، وہ ایک خلیفہ کے انفرادی فیصلے تھے۔ اور صحابہؓ کا یہ عمومی رجحان تھا کہ خلیفہ نے جو فیصلہ کر دیا ہے، اس کے خلاف کھڑے نہ ہوں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ صحابہ کا ان پر اجماع ہو گیا تھا۔ اور خلفاء وقتاً فوقتاً ان کو اپنی صوابدید کے مطابق تبدیل کرتے رہے۔

اولیات عمرؓ کا جو حوالہ دیا جاتا ہے کہ نص یہ تھی اور فیصلہ یہ تھا، درحقیقت ایسا بالکل نہیں ہوا کہ حضرت عمرؓ نے کسی نص کو منسوخ کر دیا ہو۔ حضرت عمرؓ نے صرف یہی کیا کہ ایک مجتہد کے طور پر یہ بتایا کہ نص کہاں نافذ العمل ہو گی۔ وہ تعبیر و تشریح اور نفاذ کا مسئلہ تھا، نہ کہ نص کو منسوخ کرنے کا مسئلہ۔

پھر سیاست شرعیہ کی بات آگے چلی تو اس کے نتائج کیا نکلے، زیادہ حساس دائرے میں تو میں تفصیلات میں نہیں جاتا۔ لیکن حجاج بن یوسف نے ایک لاکھ لوگوں کو بغیر کسی جنگی وجہ کے إنما جزاء الذین یحاربون اللہ ورسولہ کی آیت سے غلط استدلال کرتے ہوئے سیاست شرعیہ کی بنیاد پر قتل کروایا یا قتل کیا۔ اور جب ہم اس دور کی تاریخ یا ادبیات پڑھتے ہیں تو لگتا ہے کہ ہر خلیفہ کے دور میں السیف والنطع، یعنی تلوار اور قالین بچھا ہوتا تھا کہ کسی بھی وقت کسی بھی شخص پر سیاست شرعیہ نافذ ہو جائے گی۔ حرابہ کی قرآن میں کئی صورتیں ذکر ہوئی ہیں لیکن فقہا نے اس کو ڈکیتی کے ساتھ خاص کر دیا، حالانکہ وہ خاص نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سیاست شرعیہ کے نتیجے میں کئی خرابیاں در آئی تھیں چنانچہ ان کو ختم کرنے کے لیے اس کو خاص کرنا پڑا۔

ابھی کل تک ہم دیکھتے ہیں کہ خلافت عثمانیہ میں شیخ الاسلام فیصلہ کرتا تھا کہ بڑے بھائی کو چھوڑ کر باقی جتنے بھائی ہیں ان سب کو قتل کر دیا جائے کہ یہ کل کو فتنہ پیدا کریں گے؛ کیونکہ الفتنة

أشد من القتل اس لیے وہ سب قتل کر دیے جاتے تھے۔ اگر ہم آج بھی یہ چاہتے ہیں کہ اپنے حکمرانوں کو اور اپنی پولیس کو اور اپنے تھانوں کو سیاست شرعیہ کے اختیارات دے دیں تو اس کے بعد آپ یہ دیکھیں گے کہ کس کی جان مال اور عزت محفوظ رہے گی۔

مسلح تصادم کے موقع پر جنسی جرائم کا ارتکاب اور اسلامی تعلیمات

ڈاکٹر سید عزیز الرحمٰن *

پس منظر

دنیا بھر میں جنگ تو محض لڑنے اور دشمن کو نابود کر دینے کا نام ہے، پھر عربوں کے ہاں تو لڑائی ایک شوق، ایک روایت اور ایک کلچر کے ساتھ ساتھ ایک تفریح کی حیثیت بھی رکھتی تھی، تب ہی تو ایک شاعر کہتا ہے:

لقد زعمتم بأنا لا نقاتلكم

إنا لأمثالكم يا قومنا قتل[1]

(تم یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ تم سے جنگ نہیں کریں گے، حال آں کہ اے قوم! ہم تو تم جیسوں کے لیے بڑے خوں خوار ہیں)۔

ایک اور شاعر کہتا ہے:

وأحيانا على بكر أخينا

إذا ما لم نجد إلا أخانا[2]

(اگر کبھی ہمیں [قتل و قتال کے لیے] کوئی حریف قبیلہ نہیں ملتا تو ہم اپنے برادر حلیف قبیلے بنی بکر پر ہی حملہ کر دیتے ہیں)۔

اس بنا پر ان کے ہاں دوران جنگ کسی ضابطے، قاعدے اور کسی قانون یا اخلاقی تقاضوں کی پاس داری کا تصور تک نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ تھا کہ سال بھر میں چار مہینوں کو یہ تقدس دیا گیا

---

* نگران، ریجنل دعوہ سینٹر (سندھ) کراچی، دعوہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

۱۔ احمد حسن زیات، تاریخ ادب عربی، کراچی، قدیمی کتب خانہ، ص ۴۵

۲۔ دیوانہ حماسہ، کراچی قدیمی کتب خانہ، ص ۶۲

تھا کہ ان میں جنگ نہیں کرتے تھے، اس میں بھی یوں چور راستہ نکال لیا گیا تھا کہ نسیئ کی بنیاد پر مہینوں کو ترتیب تبدیل کر لیا کرتے تھے، چناں چہ تاریخ شاہد ہے اور ہزاروں سال سے جنگ و جدل کا یہی نتیجہ نکلتا آرہا ہے کہ مفتوح قوم کی اینٹ سے اینٹ بجادی جاتی ہے، اور فتح پانے والے اپنے مدمقابل کو کبھی برداشت نہیں کرتے، بل کہ محض شبہ میں اسے تہس نہس کر کے رکھ دیتے ہیں، اور ذرا ذرا سی بات پر لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ اوراق تاریخ شاہد ہیں کہ جہاں فاتح قوم نے سفاکیت و درندگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا، وہیں صنفِ نازک کی چادرِ عصمت کو تار تار کیا، اور فاتح قوم کی ہمیشہ یہ روش رہی کہ اس نے اپنی فتح اور کامیابی کا جشن منانے، اور اپنی دشمنی کا بدلہ لینے کی خاطر خواتین کا بھرپور استحصال کیا۔

جنگ کے دوران خواتین کی عصمت دری کو ایک جنگی ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کا چلن بھی بہت پرانا ہے، زمانۂ جاہلیت میں مفتوح قوم کی عورتوں کو بے پردہ کرنا، ان کو بے حرمت کرنا، ان کی تذلیل و تحقیر فاتح قوم کے لیے باعثِ فخر سمجھی جاتی تھی۔

عامر بن الطفیل (م ۱۰ھ) جنگ فیف الریح میں اپنے قبیلے کی فتح کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

بَقَرْنا الحَبَالی من شَنُوءَةَ بَعْدَمَا

خبطنا بفَيفِ الرّيحِ نَهداً وخثعَمَا

(ہم نے قبیلہ شنوءہ کی حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر دیے، اس سے پہلے ہم فیف الریح میں قبیلہ نہد اور قبیلہ خثعم کو بھی کاری ضرب لگا چکے تھے)۔

یہ قتل و غارت گری صرف عربوں تک محدود نہیں تھی، بل کہ اس کے علاوہ دیکھیے کہ صلیبی جنگوں کا سلسلہ تقریباً ساڑھے تین سو سال تک رہا، صلیبی جہاں جاتے تھے وہاں قتل و غارت گری، عصمت دری میں کوئی کسر نہ چھوڑتے تھے۔

آٹھویں صدی میں رومی قبائل اپنے قبائل میں عورتوں کی کمی کو پورا کرنے کے لیے ہمسایہ ملک اطالیہ کے قبائل کی عورتوں پر حملے کر کے ان سے جنسی تسکین حاصل کرتے تھے۔

۱۲۱۸ء میں جب تاتاری خوارزم شہر پر قابض ہوئے تو انہوں نے اپنی پسند کی عورتوں کو جنسی تسکین حاصل کرنے کے لیے الگ کیا اور باقی عورتوں کے لباس اتروا کر ان کے دو گروہ بنا کر ان کا آپس میں مکوں کا مقابلہ کروایا اور پھر ان کو تلواروں سے شہید کر دیا۔[1]

یہ سلسلہ تا ایں وقت کسی نہ کسی صورت میں جاری ہے، جس کی تفصیل طوالت کا باعث ہے۔

خواتین قیدیوں پر تشدد اور اسلام

خواتین قیدیوں پر جنسی تشدد کے حوالے سے اسلام کی تعلیمات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

الف: ایک تو وہ اصولی اخلاقی ہدایات ہیں، جو جنگ جیسا موقع پیش آنے پر اہل ایمان کو دی گئی ہیں، اور مسلح تصادم کے وقت ان کو پیش نظر رکھنا لازم قرار دیا گیا ہے، اس میں خواتین کے عمومی احترام کو دیگر کم زور یا جنگ سے غیر متعلق طبقات کے احترام کے ساتھ لازم قرار دیا گیا ہے، اسی ضمن میں ظاہر ہے کہ جنسی جرائم جیسے قبیح اور بھیانک جرم کا تصور بھی ممکن نہیں۔

ب: دوسرے خاص میدان جنگ میں اور قیدیوں کے ساتھ جنسی تشدد اور جنسی جرائم کا ارتکاب وغیرہ۔ اس پر آگے چل کر بات ہو گی۔

اس سے بھی قبل اسلام نے تو عمومی حالات میں بھی اپنے پیروکاروں کی ذہنی پاکیزگی کا پورا پورا اہتمام کیا ہے اور جنسی آلودگی کے پہلے مرحلے بد نظری ہی سے بچنے کی از حد تاکید کی ہے۔ لیکن اسلام کے جنگی قوانین کے مطابق دورانِ جنگ بھی نہ تو کسی عورت کو قتل کیا جاسکتا ہے اور نہ اس کی عفت و عصمت کو نقصان پہنچانے اور اسے داغ دار کرنے کی اجازت ہے۔ دوران جنگ دشمن کی عورتوں پر ہاتھ اٹھانے اور ان کی عصمت دری کرنے کی سختی سے ممانعت کر دی گئی۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لشکر کی روانگی کے وقت جنگی برتاؤ کے متعلق فوجیوں کو خاص ہدایات دیتے۔ اس کی تفصیلات بہت وضاحت سے موجود ہیں، انہیں دہرانا تحصیل

۱۔ منہاج سراج، طبقات ناصری، ترجمہ: غلام رسول مہر، لاہور، مرکزی اردو بورڈ ۱۹۷۶ء، ۲: ۱۸۵

حاصل ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے شام کی طرف لشکر کے ساتھ یزید بن ابی سفیان، عمرو بن العاص اور شرحبیل ابن حسنہ رضی اللہ عنہم کو روانہ کیا تو درج ذیل ہدایات دیں:

ولا تغرقن نخلا ولا تحرقنها، ولا تعقروا بهيمة، ولا شجرة تثمر، ولا تهدموا بيعة، ولا تقتلوا الولدان ولا الشيوخ ولا النساء.[1]

کھجور کے باغات کو تباہ و برباد کرنا نہ انہیں جلانا، نہ کسی چوپائے کو ہلاک کرنا، نہ کسی پھل دار درخت کو کاٹنا، نہ کوئی گرجا گرانا، بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو قتل نہ کرنا۔

جناب رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ایک واقعہ بعد میں عصمت دری کی فقہی مسائل واحکامات کی بنیاد بنا، چناں چہ سنن اَبی داود میں ہے:

عن علقمة بن وائل عن أبيه: أن امرأة خرجت على عهد النبي - صلى الله عليه وسلم - تريد الصلاة، فتلقاها رجل، فتجللها، فقضى حاجته منها، فصاحت، وانطلق، فمر عليها رجل، فقالت: إن ذاك فعل بي كذا وكذا، ومرت عصابة من المهاجرين، فقالت: إن ذلك الرجل فعل بي كذا وكذا، فانطلقوا فأخذوا الرجل الذي ظنت أنه وقع عليها، فأتوها به، فقالت: نعم هو هذا، فأتوا به النبي - صلى الله عليه وسلم -، فلما أمر به قام صاحبها الذي وقع عليها، فقال: يا رسول الله - صلى الله عليه وسلم -، أنا صاحبها، فقال لها: "اذهبي، فقد غفر الله لك" وقال للرجل قولا حسنا -قال أبو داود: يعني الرجل المأخوذ- وقال للرجل الذي وقع عليها: ارجموه، فقال: "لقد تاب توبة لو تابها أهل المدينة لقبل منهم.

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں نماز پڑھنے کے ارادے سے نکلی تو اس سے ایک مرد ملا، جس نے اسے دبوچ لیا، اور اس

۱۔ بیہقی، السنن الکبری، بیروت، دار الکتب العلمیۃ: رقم الحدیث ۱۸۱۲۵

سے اپنی خواہش پوری کی تو وہ چلائی، وہ جا چکا تھا، اتنے میں اس کے پاس سے ایک اور شخص گزرا تو وہ کہنے لگی کہ اس (فلاں) نے میرے ساتھ ایسا ایسا کیا ہے، اتنے میں مہاجرین کی ایک جماعت بھی آ گئی، ان سے بھی اس نے یہی کہا کہ اس نے اس کے ساتھ ایسا ایسا کیا ہے، تو وہ سب گئے اور اس شخص کو پکڑا جس کے متعلق اس نے کہا تھا کہ اس نے اس کے ساتھ زنا کیا ہے، اور اسے لے کر آئے، تو اس نے کہا: ہاں اسی نے کیا ہے، چنانچہ وہ لوگ اسے لے کر نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے، تو آپ ﷺ نے اس کے سلسلے میں حکم دیا (کہ اس پر حد جاری کی جائے) یہ دیکھ کر اصل شخص جس نے اس سے صحبت کی تھی کھڑا ہو گیا، اور کہنے لگا: اللہ کے رسول! فی الواقع یہ کام میں نے کیا ہے، تو آپ ﷺ نے اس عورت سے فرمایا: "تم جاؤ اللہ تعالیٰ نے تمہیں بخش دیا (کیوں کہ یہ تیری رضامندی سے نہیں ہوا تھا) اور اس آدمی سے بھلی بات کہی"۔ ابو داؤد کہتے ہیں: مراد وہ آدمی ہے (ناحق) جو پکڑا گیا تھا، اور اس آدمی کے متعلق جس نے زنا کیا تھا فرمایا: "اس کو رجم کر دو" پھر آپ ﷺ نے فرمایا: "اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ سارے مدینے کے لوگ ایسی توبہ کریں تو ان کی طرف سے وہ قبول ہو جائے"۔[1]

اس روایت میں غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے اس شخص کے شادی شدہ ہونے یا نہ ہونے کی کوئی تحقیق نہیں کی اور اس شخص کو سنگ سار کیا گیا، لہٰذا معلوم ہوا کہ عصمت دری کی سزا زیادہ سخت ہونی چاہیے۔

اسی طرح اس موضوع پر ہمیں صحابہ کرامؓ اور تابعین کرامؒ کے واقعات سے بھی بہت رہ نمائی ملتی ہے۔ ایک واقعے میں عصمت دری کرنے والے شخص پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حد جاری کی۔ چنانچہ روایت میں آتا ہے کہ ایک آدمی نے ایک عورت کے ساتھ زبردستی زنا کیا، پس

۱۔ ابو داؤد السجستانی، دار الرسالۃ العالمیۃ، کتاب الحدود، رقم الحدیث: ۴۳۷۹؛ کذا فی الترمذی، تحت رقم ۱۴۵۴

اسے مفضاۃ کر دیا (اس کے نتیجے میں دونوں شرم گاہیں ایک ہو گئیں) تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس آدمی پر حد جاری کی اور ثلث دیت کا جرمانہ بھی مقرر کیا۔[۱]

جبکہ ایک موقع پر حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے عصمت دری کرنے والے شخص کو سزا دینے کے بعد متاثرہ عورت کا غلام بنایا۔ چنانچہ ایک روایت میں مذکور ہے کہ ایک حبشی نے ایک عورت کی عصمت دری کی تو عمر بن عبد العزیز نے اس پر حد جاری کی اور اس عورت کو اس شخص کی گردن کا مالک بنا دیا۔[۲]

بالکل اسی طرح حسن بصریؒ نے بھی عصمت دری کرنے والے شخص کی یہی سزا تجویز فرمائی تھی۔[۳]

اسلام نے عام حالات میں بھی (جنگی حالات کا ذکر ہی نہیں) خواتین کو اس قدر قوت عطا کی ہے کہ اگر کوئی خاتون اپنا دفاع کرتے ہوئے مرد کو قتل کر دے تو عورت سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔

چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ ایک آدمی نے ہذیل کے ایک آدمی کی مہمان نوازی کی، ان کی ایک لڑکی لکڑیاں کاٹنے گئی تو اس آدمی نے اس سے بدکاری کا ارادہ کیا، اس لڑکی نے پتھر اٹھا کر اسے قتل کر دیا، معاملہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لایا گیا، آپ نے فرمایا کہ اسے اللہ نے قتل کیا، اس کی دیت کبھی ادا نہیں کی جائے گی۔[۴]

ان روایات سے واضح ہوتا ہے کہ جس عورت کی عصمت دری کی گئی، اس سے گواہوں کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس ضمن میں قرائن و آثار بھی قوی شہادت کا درجہ رکھتے ہیں، اگر کوئی اپنی عزت و عصمت کی حفاظت کرتے ہوئے جبر کرنے والے کو قتل بھی کر دے تو اس سے قصاص

۱۔ ابو بکر بن ابی شیبہ، المصنف، بیروت: دار القبلہ ۴: ۲۹۴، حدیث نمبر ۲۸۴۷۵

۲۔ ابو بکر ابن شیبہ ۱۴: ۴۳۹، حدیث نمبر ۲۹۰۱۴

۳۔ ایضاً، حدیث نمبر ۲۹۰۱۷

۴۔ ایضاً ۱۴: ۲۶۰، حدیث نمبر ۲۸۳۶۹

طلب نہیں کیا جائے گا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ عصمت دری چاہے دورانِ جنگ ہو یا بعد از جنگ ہو یا عام حالات میں ہو بہ ہر صورت وہ محاربہ میں داخل ہے۔

چنانچہ ارشاد ربّانی ہے: ﴿إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الأَرْضِ ذَلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ [المائدۃ۵: ۳۳] (ان لوگوں کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرنے میں لگے ہوئے ہیں بس یہ ہے کہ قتل کیے جائیں یا سولی پر لٹکائے جائیں یا ان کے ہاتھ پاؤں بے ترتیب کاٹ دیے جائیں۔ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں دردناک عذاب)۔

معروف تابعی امام سدی نے عصمت دری کو محاربہ قرار دیتے ہوئے ایسے شخص کی سزا قتل بیان فرمائی ہے۔

مدنی عہد میں منافقین کا گروہ بھی ایک جانب جہاں مسلمانوں کے لیے مسلسل آزمائش کا باعث بنا، وہیں بہت سے احکامات کے نزول کا بھی باعث بنا، چناں چہ علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مرجفین وہ منافق ہیں جو عورتوں کا پیچھا کر کے ان کو چھیڑتے تھے، ان کو مغلوب کر کے ان سے بدکاری کیا کرتے تھے تو یہ منافق جو عورتوں کا پیچھا کر کے ان کو چھیڑتے ہیں، ہم آپ کو ان پر مسلط کر دیں گے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ہم ان کے بارے میں سکھائیں گے پھر اللہ نے فرمایا ملعون ہیں، پھر اس آیت مبارکہ کی تفصیل بیان کی گئی کہ جہاں کہیں بھی وہ عورتیں چھیڑتے ہوئے پائیں جائیں ان کو پکڑا جائے اور قتل کیا جائے، پھر امام سدی نے فرمایا: قرآن مجید میں ایک ایسا حکم ہے جس پر عمل نہیں کیا جاتا۔ اگر کوئی شخص یا کچھ افراد کسی عورت کا پیچھا کریں اور اس کو زبردستی پکڑ کر اس کے ساتھ بدکاری کریں تو ان کی سزا سو کوڑے لگانا یا رجم کرنا نہیں، بل کہ یہ ہے کہ انھیں پکڑ کر ان کی گردنیں اڑا دی جائیں۔ اللہ کی سنت ہے ان لوگوں کے بارے میں جو پہلے گزر چکے، اسی طرح گزری ہوئی امتوں جو شخص ایسا کرتا اس کے ساتھ ایسا ہی کیا جاتا اور آپ اللہ کی سنت کو

بدلا ہوا نہیں پائیں گے، پس جس نے عورت کا پیچھا کرتے ہوئے اس کو چھیڑا اور اس کو مغلوب کیا اور وہ شخص قتل کیا گیا تو اس کے قاتل پر دیت نہیں ہوگی کیونکہ یہ مقتول، عورت کو چھیڑ تا تھا۔[۱]

مسلمان فقہائے کرام کے ہاں یہ مسئلہ اس قدر اہمیت کا حامل ہے کہ اس کی جزئیات تک انہوں نے وضاحت کے ساتھ بیان کی ہیں۔ چنانچہ امام مالک کی رائے یہ ہے کہ ہمارے ان نزدیک اس شخص کا حکم جو عورت کے ساتھ زبردستی زنا کرتا ہے، چاہے عورت باکرہ ہو یا ثیبہ، یہ ہے کہ اگر وہ عورت آزاد ہے تو اس مرد پر اس کا مہر مثل لازم ہوگا اور اگر باندی ہے تو جتنی قیمت میں کمی ہوئی ہے وہ لازم ہوگی اور اس سارے معاملہ میں سزا (حد زنا) اس مرد پر ہوگی اور عورت پر سزا نہ ہوگی۔[۲]

اسی طرح امام محمد کی رائے ہے کہ جب عورت کے ساتھ زبردستی زنا کیا گیا تو اس پر حد نہیں اور جس شخص نے زبردستی کی ہے، اس پر حد ہوگی، پس جب حد واجب ہو جائے تو مہر باطل ہو جائے گا اور ایک ہی جماع میں حد اور مہر دونوں واجب نہیں ہو سکتے، اگر شبہ کی وجہ سے حد ساقط ہوگی تو مہر واجب ہوگا۔ یہی امام ابو حنیفہ، ابراہیم نخعی اور عام فقہا کا مسلک ہے۔[۳]

اسی طرح اس مسئلے میں معروف فقیہ علامہ ابن عبد البر مالکی کی رائے یہ ہے کہ علما کا اس بات پر اجماع ہے کہ زبردستی زنا کرنے والے پر حد جاری کی جائے گی، اگر حد کو واجب کرنے والا بینہ یعنی چار گواہ گواہی دے دیں یا وہ اقرار کر لے اور اگر یہ نہ ہو یعنی نہ چار گواہ نہ اقرار تو اس کو تعزیری سزا دی جائے گی۔

جبکہ علامہ ابن حزم ظاہری کی رائے یہ ہے کہ محارب وہ شخص ہے جو رات کو چلنے والوں کو ڈرائے، چاہے اسلحہ سے یا بغیر اسلحہ کے، رات کو یا دن کو، شہر میں یا جنگل میں، خلیفہ کے محل میں یا مسجد میں، چاہے انہوں نے اپنے لیے کسی کو امام بنا کر پیش کیا یا خلیفہ کے سوا کسی کو نہیں کیا، اس کی

۱۔ آلوسی، شہاب الدین محمود بن عبد اللہ الحسینی، روح المعانی، بیروت دار الکتب العلمیہ ۱۴۱۵ھ، ۱۱: ۲۶۷

۲۔ مالک بن انس، الموطا، موسسۃ زاید بن سلطان آل نہیان للاعمال الخیریۃ والانسانیۃ، ۲۰۰۴ء: ۴: ۱۰۶۳

۳۔ امام محمد، الموطا، دمشق، دار القلم، ۲۰۰۵ء، ۳: ۹۷

فوج کے ساتھ کیا یا بغیر فوج کے، صحرا میں راستہ کاٹے ہوئے یا گاؤں کے ان لوگوں کا جو اپنے گھروں میں آباد ہیں یا قلعہ والوں کا اسی طرح، یا کسی بڑے یا چھوٹے شہر کا، اسی طرح ایک ہوں یا زیادہ۔ تو ہر ایک جو گزرنے والے سے لڑا اور راہ چلنے والوں کو ڈرایا جان سے مار ڈالنے یا مال لوٹنے یا زخمی کرنے یا عصمت دری کرنے کے ذریعے تو وہ محارب ہے چاہے کم ہو یا زیادہ اس پر اور اس کے ساتھیوں پر محاربین کا حکم لگے گا جو آیت میں بیان کیا گیا ہے۔[1]

فقہائے کرام نے عورت کی عصمت دری کو محاربہ میں شمار کیا ہے، جبکہ معروف حنفی فقیہ علامہ سرخسی نے عصمت دری کی مختلف صورتوں کو پوری تفصیل سے بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ جب گواہ اس بات پر قائم ہو جائیں کہ اس مرد نے اس خاتون کو مجبور کر کے اس کے ساتھ واقعتاً زنا کیا ہے تو اس مرد کو حد لگائی جائے گی۔ عورت کو نہیں لگائی جائے گی۔ اس لیے کہ مرد پر حد کا وجوب توبیخ کے لیے ہے اور یہ عورت تو ملامت اور سرزنش کر کے (زنا پر) قدرت دینے سے انکار کرنے والی تھی۔ یہاں تک کہ اس خاتون کو (انکار کے باوجود) اس مرد نے مجبور کر دیا۔ اور یہ "اکراہ" اس خاتون کی طرف سے گناہ صادر ہونے کی بھی نفی کرتا ہے، کیونکہ اس عورت نے جب اس کو قدرت دی تو ہلاکت کی وعیدوں کے ساتھ (مجبوراً) دی۔ لہٰذا اس خاتون سے جب گناہ ختم ہو گیا تو حد کو توبہ طریق اولی اس سے ختم ہو جانا چاہیے۔ اور بندے پر تو بہر کیف حد لگائی جائے گی؛ اس لیے کہ اس نے زنا کے عمل کو تکمیل تک پہنچایا ہے اور اس لیے حد لگائی جائے گی کیوں کہ اس شخص کا مجبور کر کے یہ کام کرنا زیادہ سنگین ہے، بہ نسبت اس سے کہ وہ عورت کو راضی کر کے کرتا۔[2]

امام سرخسی مزید لکھتے ہیں:

کسی مرد نے کسی عورت کو مجبور کر کے اس سے زنا کیا اور اس کے عضو مخصوص کو نقصان پہنچا دیا تو مرد پر زنا کی حد ہو گی۔ پھر دیکھا جائے گا کہ اگر وہ پیشاب روک سکتی ہو تو مرد پر

۱۔ ابن حزم، المحلی، بیروت، دار الفکر ۱۱: ۳۰۸

۲۔ سرخسی، المبسوط، بیروت، دار المعرفہ ۱۴۱۴ھ، ۹: ۵۴

دیت کا تیسرا حصہ جرح جائفہ کے ارش کے طور پر لازم ہو گا، اور اگر وہ پیشاب نہ روک سکتی ہو تو اس پر پوری دیت لازم ہو گی۔[1]

اگر کسی نے نابالغ بچی سے زبردستی زنا کیا اور اسے مفضاۃ کر دیا (اس کے نتیجے میں دونوں شرم گاہیں ایک ہو گئیں) (جسمانی نقصان پہنچایا) تو اس پر حدِ زنا قائم نہیں کی جائے گی، کیونکہ زنا کی حد تب واجب ہوتی ہے جب یہ فعل کامل صورت میں واقع ہوا ہو اور فعل کے کامل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا محل بھی کامل ہو، جب شرم گاہیں آپس میں مل گئی ہیں تو واضح ہو گیا کہ محل اس فعل کا محل ہی نہیں تھا۔ بہ خلاف اس صورت کے جب زنا کیا اور دونوں شرم گاہیں ایک نہیں ہوئیں (اس صورت میں حد ہو گی) کیوں کہ جب اس نے جماع کو برداشت کر لیا تو واضح ہو گیا کہ وہ اس فعل (جماع) کا محل تھی اور اس لیے کہ حد تو زجر (گناہ سے روکنے) کے لیے ہے اور زجر اس وقت ہوتا ہے جب طبیعت مائل ہوتی ہے اور عقلا کی طبیعت ایسی چھوٹی بچی کی طرف مائل نہیں ہوتی جو نہ جماع کی متحمل ہو، اور نہ ہی مشتہاۃ ہو، اس لیے حد واجب نہیں ہو گی؛ البتہ اسے تعزیر دی جائے گی، کیوں کہ اس نے ایسا کام کیا جو شرعا جائز نہیں تھا۔ پھر اگر وہ پیشاب نہ روک سکتی ہو تو اس مجرم پر دیت کا تیسرا حصہ اور مہر کا ادا کرنا لازم ہو گا۔ دیت کا تیسرا حصہ جائفہ زخم کی وجہ سے اور مہر وطی کی وجہ سے، کیونکہ ملک غیر میں وطی پر یا تو حد ہوتی ہے اور یا مالی جرمانہ۔ یہاں حد کی سزا اس فعل میں کمی کے شبہ کی وجہ سے ساقط ہو گئی، پس مہر واجب ہو گا، کیوں کہ وہ شبہ کی موجودگی میں بھی واجب ہوتا ہے اور وطی شرم گاہ کو شرم گاہ میں داخل ہونے سے ہوتی ہے اور وہ پایا گیا۔ مہر کبھی عقد سے واجب ہوتا اور کبھی وطی سے اور چھوٹی بچی سے عقد مہر کو واجب کرتا ہے۔ اور اگر وہ پیشاب نہ روک سکتی ہو تو اس مجرم پر پوری دیت ادا کرنا لازم ہو گی، کیونکہ اس نے ایسے عضو کو فاسد کر دیا جس سے پیشاب روکا جاتا ہے اور اس کا کوئی ثانی بدن میں نہیں ہے۔ اور ابو حنیفہ اور ابو یوسف کے قول کے مطابق اس پر مہر ادا کرنا لازم نہیں ہے، امام محمد کے قول کے مطابق اس پر

۱۔ ایضاً

مہر ادا کرنا لازم ہے حقیقتِ وطی پائے جانے کی وجہ سے، تو جس طرح مہر بعض دیت میں داخل نہیں ہوتا اسی طرح پوری دیت میں بھی داخل نہیں ہوتا؛ کیونکہ دیت عاقلہ پر جنایت (جرم) کی وجہ سے مؤجلاً (قسط وار) واجب ہوتی ہے اور مہر جرم کرنے والے کے مال میں حالا (فی الفور) لازم ہوتا ہے تو ایک کا دوسرے میں تداخل کیسے ہو سکتا ہے اور شیخین فرماتے ہیں کہ در حقیقت فعل ایک ہے۔ پس جب اس سے پورے نفس کا بدل واجب ہوا تو نفس سے کم تر کا نقصان اس میں داخل ہوا، جیسے کوئی شخص کسی دوسرے کے سر پر ایسی چوٹ لگائے کہ اس کی عقل چلی جائے یا اس کے سارے بال جھڑ جائیں تو اس پر پوری دیت واجب ہو جاتی ہے اور موضحہ کا ارش اس میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ تعلیمات تو عمومی نہیں۔ خاص میدان جنگ میں بھی اس نوع کی تعلیمات تفصیل سے تو نہیں لیکن اصول مبحث کے طور پر ملتی ہیں۔

دوسری جانب خاص جنسی جرائم کے حوالے سے بھی چند ہدایات ہمیں ذخیرۂ فقہ میں نظر آتی ہیں، پہلی اہم ترین بات تو یہ ہے کہ اسلام نے مفتوح قوم کی عورتوں کی عصمت و عزت کی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام کیا ہے اور عصمت دری اسلام کی نگاہ میں جرم عظیم ہے۔

دورانِ جنگ قید ہونے والی خواتین کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے یہ حکم دیا گیا کہ مردوں اور عورتوں کو الگ الگ رکھا جائے، چنانچہ فتاویٰ عالم گیری میں مفتوح اقوام کے قیدیوں کے احکام کے ضمن میں مذکور ہے: وينبغي أن يكون للنساء محبس على حدة تحرزا عن الفتنة. وعن أبي حنيفة - رحمه الله تعالى - أن المرأة تحبس في محبس النساء ولكن يحفظها الرجل.[1] عورتوں کا علاحدہ قید خانہ ہونا چاہیے، تاکہ فتنے سے بچا جاسکے، امام ابو حنیفہؒ سے منقول ہے کہ عورت کو عورتوں کے لیے مخصوص قید خانے میں قید کیا جائے گا، تاہم اس کی نگرانی مرد ہی کرے گا۔

۱۔ الھندیۃ، بیروت، دار الکتب العلمیہ ۱۴۲۴ھ، ۴: ۴۱۴

تمام فقہا کا اس پر اتفاق ہے، بلکہ عورتوں کے حصے کا نگراں افسر بھی کسی عورت ہی کو مقرر کرنا چاہیے، اگر اس قسم کی عورت میسر نہ ہو تو تقویٰ و پرہیز گاری میں معروف شخص کو منتخب کرنا چاہیے۔

اسی طرح موسوعہ فقہیہ کی یہ عبارت بھی توجہ طلب ہے: نص الفقهاء على أن يكون للنساء محبس على حدة إجماعا، ولا يكون معهن رجل لوجوب سترهن وتحرزا من الفتنة. والأولى أن تقوم النساء على سجن مثيلاتهن، فإن تعذر ذلك جاز استعمال الرجل المعروف بالصلاح على محبسهن ليحفظهن، وهو المروي عن أبي حنيفة، وإذا لم يكن هناك سجن معد للنساء حبست المرأة عند أمينة خالية عن الرجال أو ذات رجل أمين كزوج أو أب أو ابن معروف بالخير والصلاح.[1]

اوپر بیان کردہ اس تفصیل سے یہ واضح ہو گیا کہ اسلام نے دوران جنگ جنسی جرائم کی مذمت کی ہے اور اس کی روک تھام کے لیے مختلف قوانین وضع کیا ہے، حتی کہ عام حالات میں جنسی جرم کے ثبوت کے لیے چار گواہوں کی ضرورت پڑتی ہے لیکن دوران جنگ یا زبردستی عصمت دری کو محاربہ میں شمار کرکے اس کے ثبوت کے چار گواہوں کا مطالبہ نہیں کیا۔

عورت پر جنسی تشدد کا مفہوم

خلاصہ کلام کے طور پر فقہی اعتبار سے عورت پر جنسی تشدد کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ عورت کو ایسی جنسی حرکات کرنے پر مجبور کرنا جو عورت نہیں چاہتی یا کرنے میں آسانی محسوس نہیں کرتی ہے یا اس کی صحت یا نفسیاتی حیثیت کو مد نظر رکھے بغیر اس کی مرضی کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرنا، یا اسے مختلف اسالیب اور طریقوں پر عمل کرنے پر مجبور کرنا۔ ایک اور فقہی پہلو سے یہ تعریف بھی کی جاسکتی ہے کہ عورت پر جنسی تشدد کا مطلب کوئی بھی ناپسندیدہ جنسی سلوک

۱۔ لجنۃ التحقیق، الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ ۱۶: ۳۱۷

جو زبانی یا جسمانی شکل اختیار کرتا ہے۔ بین الاقوامی قانون میں عورت پر جنسی تشدد کی تعریف یوں کی جاتی ہے کہ وہ جو عام معاشرے (کمیونٹی) کے اندر ہوتا ہے، یعنی عصمت دری، جنسی حملہ، جنسی طور پر ہراساں کرنا، کام کی جگہ پر، تعلیمی اداروں میں اور دیگر جگہوں پر ہراساں کرنا، خواتین کی اسمگلنگ اور انہیں جسم فروشی پر مجبور کرنا۔ نتیجے کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ عورت کے ساتھ جنسی تشدد یہ ہے کہ جنسی نوعیت کا کوئی بھی عمل، چاہے عورت کے ساتھ زبانی ہو یا فعلی ہو، اس کا مقصد کسی بھی قسم کی طاقت، تشدد یا جبر کرکے عورت کے جسم کی سالمیت اور اس کی جنسی آزادی کو مجروح کرنا ہو۔ عورت کے ساتھ جنسی تشدد کی صورتیں، عصمت دری کی تعریف، بیوی کے علاوہ کسی عورت کے ساتھ اس کی رضامندی کے بغیر جماع کرنا، چاہے زبردستی ہو یا دھمکی دے کر یا حیلہ یا فریب کرکے۔ بعض حضرات مجرم کے سلسلے میں متاثرہ کی حیثیت کے بیان میں غیر حل شدہ عبارات سے تعبیر کرتے ہیں۔ فقہی اعتبار سے اس کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان اس کی مکمل رضامندی کے بغیر مکمل جنسی تعلق قائم کرنا۔ عصمت دری کی تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے:

ایک مکمل جنسی عمل جس میں زبردستی اور تشدد شامل ہو۔ عصمت دری کی بہت سی شکلیں ہیں، جیسا کہ فعل اور متاثرہ کے حالات اسی طرح بہ ذات خود تجاوز کے حالات ہیں۔ عورت کے ساتھ تشدد کے خاتمے کے عالمی اعلامیے کے مادہ ۲۹۴ (سزاؤں کے قانون) میں ہے۔ عصمت دری اس وقت تام ہوگی جب بیوی کے علاوہ کسی دوسری ایسی عورت (جس کی عمر جرم کے ارتکاب کے وقت مکمل اٹھارہ سال ہو) کے ساتھ تشدد اور زبردستی کرکے جنسی فعل کی شکل میں کیا گیا ہو۔

۲۔ عصمت دری ایسی عورت کے ساتھ کی جاتی ہے جو جسمانی، نفسیاتی یا ذہنی کم زوری یا نااہلی کی وجہ سے مزاحمت نہیں کرسکتی۔

۳۔ نابالغ کی عصمت دری: یہ دفعہ ۲/۱/۲۹۲ میں طے کیا گیا تھا، جس میں اس لڑکی کی عصمت دری کے بارے میں بات کی گئی تھی جس نے اپنی عمر کا پندرہواں سال مکمل نہیں کیا تھا، اور اس کی سزا موت ہے۔

۴۔ نابالغ کے ساتھ ہمبستری: نابالغ کے ساتھ جماع کرنا عصمت دری کی ایک خاص شکل ہے، کیونکہ یہ عصمت دری کے تصور سے الگ ہونے کی ایک قسم ہے جو لازمی طور پر متاثرہ عورت کے عدم اطمینان یا تشدد کا تقاضا کرتی ہے، لیکن اس میں نابالغ کے ساتھ جنسی تعلق کے جرم کا معاملہ الگ ہے، کیونکہ اس فعل میں کسی قسم کا جسمانی یا اخلاقی جبر، یا یہاں تک کہ دھوکا دہی، شامل نہیں ہے۔ بلکہ یہ فعل درحقیقت متاثرہ کی مکمل رضامندی سے کیا جاتا ہے، مگر اس رضامندی کا قانونا اعتبار نہیں کیا جاتا، کیوں کہ متاثرہ قانونی طور پر مقرر کردہ سمجھ داری کی عمر کو نہیں پہنچی ہے، وہ معاملہ جس کی وجہ سے رضامندی معلوم ہو جاتی ہے اور جرم قائم ہو جاتا ہے۔[1]

نتائج بحث

- عفت و عصمت کے اسلامی تصور کے تحت پہلے مرحلے میں اسلام ایسی مثالی صورتِ حال قائم کرنے کا خواہش مند ہے، جس کے تحت ہر طبقہ، ہر حالت میں مکمل حفاظت کے ساتھ زندگی گزارنے میں کامیاب ہو سکے۔
- اگر اس ضمن میں رکاوٹیں پیش آئیں، جو انسانی مزاج کے مطابق بالکل ناگزیر ہیں، تو ان کے تدارک کے لیے اسلام قانون سازی بھی کرتا ہے، اور اخلاقی تعلیمات دے کر تربیت بھی کرتا ہے۔
- جنگ ایک عارضی صورت حال ہے، انسانی مجبوریوں کے سبب اس کی اجازت دی گئی ہے، مگر اس کے لیے قواعد اور قوانین وضع کیے گئے ہیں، انسان اس میدان میں اسلام کی روشنی میں آزاد نہیں۔

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: نیفین سمیر سلمان الامیر، الحمایۃ الجزائیۃ للمرأۃ ضد الحنف، رسالۃ ماجستیر، جامعہ الشرق الاوسط، اردن

- جنگی قوانین میں قید کا تصور موجود ہے، اور اس کے قواعد بھی ضبط شدہ موجود ہیں، ان کے تحت تمام قیدی انسانی دائرے میں بہت سے حقوق رکھتے ہیں۔
- قیدیوں کی حفاظت، نگہ داشت اور ان کی ضرورتوں کی تکمیل کا اسلام خاص حکم دیتا ہے۔
- قیدیوں کے یہ احکامات بلا تفریق ہیں، پھر صنف نازک کی حیثیت سے خواتین کا خاص خیال رکھنے کا حکم ہے۔
- جنسی تشدد ہر حیثیت میں بڑا جرم ہے، اور اس کی سنگینی کے سبب اس جرم کے مرتکبین کے لیے سزائیں بھی اسلام سخت ترین تجویز کرتا ہے۔
- اس تشدد اور جرم سے محفوظ رکھنے کے لیے بھی اسلام نے احکامات تجویز کیے ہیں۔

هذا ما عندی واللہ أعلم بالصواب

تنازعات کے دوران میں جنسی تشدد: اسلامی نقطۂ نظر

مفتی محمد زاہد*

میں اپنے موضوع کو دو حصوں کے تحت بیان کروں گا۔ پہلے حصے میں ان فقہی احکام کا ذکر کیا جائے گا جو دورانِ جنگ یا مسلح تصادم کی صورت میں جنسی استحصال یا جنسی تشدد کی روک تھام کے لیے ہیں۔ دوسرے حصے میں وہ احکامات زیر بحث لائے جائیں گے جو ان جرائم کے ارتکاب کی صورت میں عمل میں آتے ہیں۔

موضوع کے پہلے حصے کی دو فقہی تکییفات ہیں اور دونوں کے لیے مختلف احکام ہیں۔ ان دونوں حالتوں کے لیے اسلامی فقہ میں علاحدہ علاحدہ اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں جن کو دیانت اور قضا سے موسوم کیا جاتا ہے۔ دیانت سے مراد یہ ہے کہ اگر کسی عدالت میں کوئی جرم ثابت نہیں ہو پاتا یا کسی وجہ سے آدمی سزا سے بچ جاتا ہے تو بحیثیت اللہ اور رسول پر ایمان رکھنے والے کے اور اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق اس کی ذاتی ذمہ داری کیا ہے؟ اگر اس کا ضمیر زندہ ہے اور وہ اللہ، رسول اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے تو اس سے جس رویے کی توقع کی جاتی ہے، اسے فقہا کی اصطلاح میں دیانت کہا جاتا ہے۔

سب سے پہلی چیز جو اس حوالے سے ذہن میں رکھنے کی ہے اور اسی سے ہمیں ایک سوال کا جواب بھی ملتا ہے کہ جنگوں کے دوران اس طرح کے جنسی جرائم کا تذکرہ ہمیں اسلامی فقہ میں اتنی تفصیل سے نہیں ملتا۔ اس کی وجہ ایک مومن کا جنس کے حوالے سے نقطہ نظر ہے۔ اسلام میں کسی بھی چیز کے دو پہلو ہو سکتے ہیں: ایک اباحت یعنی یہ کہ اس چیز کے بارے میں اصلاً اسلام کی طرف سے اجازت ہے، اگر آپ منع کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے کسی وجہ اور دلیل کی ضرورت ہے، اگر روکنے کی کوئی وجہ نہیں ہے تو ہم یہ کہیں گے کہ یہ جائز ہے، مثلاً کھانا پینا۔ دوسرا حذر یعنی

---

* شیخ الحدیث، جامعہ اسلامیہ امدادیہ، فیصل آباد

کچھ چیزیں یا افعال ایسے ہیں جن کو بروئے کار لانے میں اسلام کی طرف سے اصلاً پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ یہ شجرہ ممنوعہ ہے، البتہ اجازت کے لیے کسی وجہ اور دلیل کی ضرورت ہے۔

قرآن نے جنسی تعلق کے حوالے سے زنا کا لفظ ذکر کیا ہے اور یہ کہا کہ ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً﴾ [الاسراء ۱۷: ۳۲] لیکن اس کی وضاحت کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے اس کے مفہوم کو وسیع کر دیا اور یہ فرمایا کہ کسی کی طرف غلط نظر سے دیکھنا، کسی کی طرف ہاتھ بڑھانا یا کسی کی طرف قدم اٹھانا یا کسی کے بارے میں غلط تصور اور خیال یہ سب کچھ جنسی عمل میں داخل ہیں۔ اگرچہ شدت اور سنگینی کے لحاظ سے یہ جنسی عمل سے کم تر درجے کا ہو گا، لیکن یہ سب زنا کے مفہوم میں داخل ہیں۔

اس لیے جنسی تعلق چاہے جس نوعیت کا بھی ہو اس کے اندر اصل حذر ہے، یعنی اس میں اصلاً پابندی ہے اور ایسے سب افعال اس اصول کے اندر داخل ہیں۔ قرآن کریم نے اس سے صرف دو استثنا کیے ہیں اور یہ صراحت کی ہے کہ اس استثنا سے ہٹ کر جس قسم کا بھی جنسی تعلق ہو گا چاہے، وہ مسلح تصادم میں ہو یا عمومی حالات میں ہو، وہ زیادتی کے ضمن میں آئے گا اور اسے "فاولئك هم العادون" سے بیان کیا گیا ہے۔ اور قتال کے سیاق میں 'عدا' یا 'اعتداء' سے قرآن کریم نے خاص طور پر منع کیا ہے۔ "فاولئك هم العادون" اور "فلا تعتدوا" دونوں کو اگر آپس میں ملائیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن کی ایک آیت دوسری آیت کی تفسیر کر رہی ہے۔ تو یہ ایک چیز ذہن میں رکھنی چاہیے۔ یہاں تک کہ ہمارے بعض معاصر مفسرین نے تو آدم و حوا علیہما السلام کے واقعے سے یہ اخذ کیا ہے کہ جنسی تعلق صرف محاور تاً شجرہ ممنوعہ نہیں، بلکہ ان کو جس شجرہ سے منع کیا گیا تھا وہ باقاعدہ کوئی درخت نہیں تھا، بلکہ درحقیقت وہ یہی تعلق تھا۔ یہ بھی اسلامی نقطہ نظر سے ایک رائے ہے اور اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کی نظر میں جنس ایک شجرہ ممنوعہ ہے۔ عام حالات میں خصوصاً مغربی فکر میں اس کو شاید بہت اجنبیت کی نظر سے

دیکھا جائے، لیکن یہاں اس خاص سیاق کے اندر جو کہ پوری دنیا کا مسئلہ ہے اس میں یہ نقطہ نظر اور یہ ذہنیت بہت زیادہ فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے جنسی تعلق کے بارے میں اصل یہی ہے کہ اس کے قریب نہیں جانا۔ چنانچہ اسلامی معاشرہ عام طور پر اس حوالے سے سخت رویہ اپناتا ہے اور اس کو بہت سنگین عمل گردانتا ہے۔ اس حوالے سے ایک لطیفہ بھی مشہور ہے کہ کسی مسجد کے امام صاحب کی شادی ہوئی، کچھ عرصے کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں اولاد کی نعمت سے بھی نوازا۔ جب بچے کی خبر آئی تو محلے کی کچھ خواتین کہنے لگیں ہم تو ان کو بہت نیک سمجھتے تھے، یعنی بچے پیدا کرنا مولویوں کا کام نہیں۔ چنانچہ یہ محض ایک لطیفہ نہیں ہے، بلکہ مسلم معاشرے میں اس حوالے سے جو ایک دینی ذہنیت پائی جاتی ہے، یہ درحقیقت اس کا اظہار ہے۔ تو ایک یہ چیز ہمیں اپنے ذہن میں رکھنی چاہیے اور دوسری یہ کہ قرآن نے اس حوالے سے صرف دو مستثنیات بیان کی ہیں: ایک بیوی اور دوسری اپنی باندی۔

باندیوں اور غلاموں کا معاملہ اسلام میں جنگی قیدیوں سے بالکل الگ ہے اور اگر میں اس کی تفصیل میں جاؤں تو بحث کا موضوع بدل جائے گا۔ تاہم یہ مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ کسی فرد کا جنگی قیدی بننا اور کسی خاتون کا کنیز یا باندی بننا یہ دونوں مترادف یا ہم معنیٰ نہیں، بلکہ دو جداگانہ مسئلے ہیں، اور ہرگز ضروری نہیں کہ ہر جنگی قیدی اس زمرے میں شامل ہو۔ اس کی الگ سے شرائط اور تفصیلات ہیں۔ غلام اور باندی ایک طرح سے خاندان کا حصہ بن جاتے تھے۔ اسلام نے اگرچہ اس کو برقرار رکھا ہے، لیکن یہ الگ بحث ہے کہ اس کو کیوں برقرار رکھا گیا ہے۔ لیکن جب تک غلامی کا یہ نظام برقرار رہا، اسلامی معاشرے غلاموں اور باندیوں کو خاندان کا حصہ سمجھا جاتا رہا۔ جس طرح بچوں کا خرچہ ہے اسی طرح ان کا خرچہ ہوتا تھا حتیٰ کہ اگر ان کو آزاد کر دیا جاتا تو تب بھی خاندانی تعلق باقی رہتا تھا۔ اور بعض اوقات وراثت میں اس کے اثرات مرتب ہوتے تھے۔ لہٰذا باندی یا غلام ہونا اور چیز ہے اور جنگی قیدی ہونا اس سے مختلف چیز ہے۔ ہماری یہاں گفتگو مسلح

تصادم کے حوالے سے ہے، جس میں ہم کسی کو زیادہ سے زیادہ جنگی قیدی کی حیثیت سے رکھ سکتے ہیں اور یہاں بھی یہی اصول لاگو ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ بھی جنسی تعلق میں اصل ممانعت اور حذر ہے۔ نیز عورت چونکہ کمزور ہوتی ہے، اس لیے اس کے ساتھ کسی بھی قسم کے تعرّض سے منع کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کے معاملے میں یہ اصول زیادہ سختی کے ساتھ لاگو ہو گا۔

عہد رسالت میں ہم دیکھتے ہیں کہ جو جنگی اصول یا قواعد وضوابط تھے، ان کی عدم پاسداری کی صورت میں شکایات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رپورٹ ہوتی تھیں، اور ان پر باقاعدہ تفتیش و تحقیق کا نظام ہوتا تھا۔ لیکن اس نوعیت کے جو باقاعدہ جنسی جرائم ہیں، عہد رسالت کی جنگوں کے اندر ان کی رپورٹ کم از کم میرے علم کی حد تک موجود نہیں۔ اس کی بنیاد وہی ہے کہ اسلامی معاشرے کا جنس کے حوالے سے تصور کیا ہے، حتیٰ کہ انتقام میں بھی میں اس کی اجازت نہیں ہے۔ یہ نکتہ بھی بڑا اہم ہے کہ انتقام کے لیے جنگ لڑنے کی اسلام میں اجازت نہیں ہے۔ اس حوالے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واقعہ ذکر کیا جاتا ہے، جس کا مستند ہونا محل نظر ہے، لیکن یہ جس سیاق میں ذکر کیا جاتا ہے یا جس اصول کے لیے ذکر کیا جاتا ہے، وہ اصول سب کے ہاں مسلم ہے۔ وہ یہ ہے کہ جنگ کے دوران ایک یہودی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قابو میں آ گیا، اور اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے چہرے پر تھوک دیا، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس بنا پر اسے فوراً چھوڑ دیا کہ اگر اب میں اس کو کچھ کہوں گا تو اس میں انتقام کا پہلو آ جائے گا۔ اسی طرح جنسی جرائم عام حالات میں تو اپنی جنسی تسکین کے لیے ہوتے ہیں، لیکن مسلح تصادم میں یہ درحقیقت انتقام کی بدترین شکل ہے، اور انتقامی نقطہ نظر سے جنگ لڑنا یا دوران جنگ انتقامی نقطہ نظر اختیار کرنا اسلامی اصولوں کی رو سے جائز نہیں۔

دوسرا پہلو قضا کا ہے، یعنی اس کو اگر ہم فوجداری نظام انصاف میں لانا چاہتے ہیں تو کیسے لائیں۔ اس کا تعلق روک تھام سے بھی ہے؛ کیونکہ جب اس پر جزا و سزا کا تصور موجود ہو گا تو اس کو روکنے میں بھی آسانی ہو گی اور اس کا تعلق دادرسی کے ساتھ بھی ہے کہ جس کے ساتھ اس طرح

کا معاملہ ہو گیا اور اس کی یہ خواہش ہے کہ مجرم کو سزا ملے تو یہ بھی ممکن ہو جائے گا۔ اس لیے جو قضا کا پہلو ہے اس کا تعلق جرم کے وقوع پذیر ہونے سے قبل اور اس کے بعد دونوں صورتوں سے ہے۔ فوجداری نظام انصاف میں اسلام کا جو بنیادی تصور ہے وہ یہ ہے کہ چند متعین سزاؤں کے علاوہ اسلام نے مدون قانون نہیں دیا۔ حدود کی شکل میں چند سزائیں ہیں، جس کے اندر اختیار سماعت اور شبہ جیسے کئی تکنیکی معاملات درپیش ہوتے ہیں۔ حکومت وقت یا مسلمانوں کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ بین الاقوامی برادری کے ساتھ اس طرح کے معاہدات میں شامل ہو جائیں جو مسلح تصادم کے دوران جنسی جرائم پر سزائیں تجویز کرتے ہیں۔ یہ تو ہو گئی دوسری بات کہ یہ جرم قضا کے دائرے میں آتا ہے، لہٰذا اس پر سزا بھی ہونی چاہیے اور سزا بھی جرم کی سنگینی کے اعتبار سے ہونی چاہیے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر کسی کے ساتھ اس طرح کا واقعہ ہو چکا ہے یا ہوتا ہوا ہم دیکھ رہے ہیں تو اس وقت ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ اسلام کا ایک اصول ہے جس کو عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ شاید وہ وعظ و نصیحت کے انداز کا اصول ہے۔ لیکن وہ درحقیقت ایک مسلمان کی ذمہ داری ہے، اور وہ ہے "نصرة المظلوم وإغاثة الملهوف"۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ یہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سات چیزوں کا حکم دیا: اور اس میں ایک "نصرة المظلوم" بھی ہے۔ ایک دوسرے کے حقوق جو اسلامی معاشرے میں ہیں، اس میں ایک یہ بھی آتا ہے کہ لا یخذله یعنی کسی پر زیادتی ہو رہی ہے اور وہ اس پر اقدام نہ کرے تو یہ درست طرز عمل نہیں ہے۔

اس کی تائید حلف الفضول سے بھی ہوتی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ہوا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کا حصہ تھے۔ جس کی اہم دفعہ یہی تھی کہ اگر ہم کسی پر ظلم ہوتا ہوا دیکھیں گے تو اس کی روک تھام کی کوشش کریں گے اور مظلوم کی مدد کریں گے۔ روایات سے پتا چلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعریف بھی فرمائی ہے۔ اس کے

علاوہ بعض صحابہ کے طرز عمل سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ یہ معاہدہ اب بھی قائم ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ کوئی تنازعہ ہو گیا تو ایک صحابی نے یہ کہا کہ اگر میں حلف الفضول کا حوالہ دے کر مدد طلب کرتا تو میرے حق میں لوگوں کا جمگھٹا اکٹھا ہو جاتا، لیکن میں نے نظر انداز کرنا مناسب سمجھا اور اپنی مدد کے لیے کسی کو طلب نہیں کیا۔

اس کی ایک اہم دفعہ یہ تھی کہ کسی کے خلاف ظلم کو ہم گوارا نہیں کریں گے۔ لہٰذا اگر کسی کے خلاف کوئی زیادتی ہو چکی ہے تو فوجداری نظام کے تحت اس کی داد رسی کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ اس کے علاوہ طبی علاج معالجہ اور ہر وہ مدد جس سے اس کی تکلیف کم کی جا سکے وہ سب اس اصول کے تحت آجاتا ہے۔

آخری بات یہ کہ عہد رسالت میں جنگی کمانڈر سے جو غلطیاں سرزد ہوئیں، ان پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت شدید انداز میں ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ اس کا مطلب ہے کہ جنگی کمانڈر پر نظر رکھنا ریاست کی یا مرکزی قیادت کی بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے ایک مہم کے دوران کچھ غیر مسلم لوگوں کے ساتھ زیادتی ہو گئی اور ان کے کچھ لوگ ناحق مارے گئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود ان کے کافر ہونے کے ان کو اس چیز کا معاوضہ ادا کیا، اور صراحتاً اس بات کا بار بار اعلان فرمایا: اے اللہ! خالد نے جو کچھ کیا ہے میرا اس سے کوئی تعلق نہیں اور میں اس سے براءت کا اظہار کرتا ہوں۔ اسی طرح کے ایک اور واقعے سے پتا چلتا ہے کہ ایک کمانڈر جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کسی مہم پر بھیجے گئے تھے، وہ جنگی قواعد و ضوابط کی صحیح پابندی نہیں کر سکے۔ واپسی پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب تفصیلات کا پتا چلا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر شدید ناراضی کا اظہار فرمایا اور صحابہ کرامؓ کو اس طرح سرزنش کی کہ اگر وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کی پیروی نہیں کر رہا تھا، یعنی جنگی قواعد و ضوابط کی پابندی نہیں کر رہا تھا تو تمہیں چاہیے تھا کہ اپنا امیر تبدیل کر لیتے۔

آج کل کی جنگی حکمت عملی کے حوالے سے دیکھیں تو یہ بات بہت حساس ہے، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم بھی صادر فرمادیا۔ یعنی میدان میں کمانڈر تبدیل کرنے کو شاید دنیا کی کوئی فوج گوارانہ کر سکے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں جنگی قواعد کی پابندی اس قدر اہم ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زیر کمان لوگوں کو یہ ہدایت فرمائی کہ اگر کسی اور مفسدے کا خطرہ نہیں ہے یا کسی بڑے نقصان کا اندیشہ نہیں تو انہیں چاہیے کہ وہ اپنا کمانڈر تبدیل کرلیں۔ چونکہ جنگی قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی کا تعلق انسان کے جذبات سے ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی پاسداری کے لیے بھی سخت قسم کے اقدامات اور مضبوط قسم کا کنٹرول ہونا لازمی ہے۔ ڈھیلے ڈھالے کنٹرول سے اس طرح کی خلاف ورزیوں کا سدباب نہیں کیا جاسکتا۔ ان تمام باتوں سے اس چیز کا اندازہ کرنا چنداں مشکل نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں جنگی قوانین کی کس قدر اہمیت تھی اور ان کی خلاف ورزی کس قدر سنگین عمل تھا۔ چنانچہ جب ہم اس کے لیے قواعد اور قوانین بنارہے ہوں یا تجویز کررہے ہوں تو اس موقع پر ہمیں یہ بات بھی مدِ نظر رکھنی چاہیے۔

مسلح تنازعات کے دوران میں جنسی تشدد کی نفسیات اور اسلامی تعلیمات

ڈاکٹر اشفاق احمد *

تمہید

شریعت اسلامی میں انسانی جان اور اس کی عزت و حرمت کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ انسانی عزو شرف کا تحفظ شریعت کے مقاصد میں سے ہے۔ یہ تحفظ جیسے حالتِ امن میں ضروری ہے اسی طرح دوران جنگ میں بھی عین مطلوب ہے۔ کسی بھی مسلح تنازعے میں لڑائی کی اجازت صرف مقاتلین اور براہ راست شریک کاروں کے ساتھ ہے۔ دیگر افراد جو مسلح تنازعے میں براہ راست شامل نہ ہوں ان کے جان ومال اور عزت و حرمت کا پاس کرنا اسی طرح ضروری ہے جیسے حالت امن میں اس کو یقینی بنانے کا حکم ہے۔ اسلامی جنگی ادب میں ہمیں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں جن میں مسلم حکمرانوں نے جنگ کے لیے روانگی سے قبل اپنے لشکر کو غیر مقاتلین بالخصوص خواتین اور بچوں کا خیال رکھنے کی ہدایت کی؛ کیونکہ اسلام کی رو سے خواتین اور بچوں کو جنگ کا ایندھن بنانے کی کسی صورت اجازت نہیں۔

موجودہ دور بالخصوص بیسویں / اکیسویں صدی میں جنگی ہتھیاروں کی ترقی اور ان کی تباہ کن صلاحیتوں میں اضافے کے بعد جنگ کی ہولناکی اور تباہی میں غیر معمولی طور پر اضافہ ہوا ہے۔ افسوس ناک امر یہ ہے کہ اس تباہی سے سب سے زیادہ بچے اور خواتین متاثر ہوتے ہیں۔ بعض اوقات جان بوجھ کر بھی خواتین اور بچوں کو بطور خاص نشانہ بنایا جاتا ہے؛ تاکہ مد مقابل فریق کو نفسیاتی طور پر کمزور کیا جاسکے۔ پھر خواتین اور بچے صرف اسلحے کا شکار ہی نہیں ہوتے بلکہ جنگ کے نتیجے میں ہجرت اور پناہ گزینی کے عذاب سے بھی گزرتے ہیں۔ اسی دوران میں جسمانی اور نفسیاتی تشدد کے ساتھ ساتھ انہیں جنسی تشدد کا نشانہ بھی بنایا جاتا ہے۔ موجودہ اور گزشتہ صدی کی

---

* ریسرچ آفیسر اسلامی نظریاتی کونسل

جنگوں میں ہزاروں خواتین اور بچے جنسی تشدد کا نشانہ بن چکے ہیں[۱]۔ باوجود اس کے کہ مسلح تنازعات کے دوران میں خواتین اور بچوں کو جنسی تشدد سے بچانے کے لیے قوانین وضع کیے گئے ہیں؛ تاہم یہ معاملہ رکنے میں نہیں آرہا بلکہ شاید اس میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے تازہ ترین مثال یوکرائن اور روس کے درمیان جنگ کی ہے جس میں ذرائع ابلاغ کی رپورٹوں کے مطابق جنسی تشدد کے متعدد واقعات سامنے آئے ہیں[۲]۔ اسی طرح مسلم ممالک میں جاری خانہ جنگی میں بھی جنسی تشدد کے جو اعداد و شمار سامنے آئے ہیں ان کی تعداد بھی کم و بیش یہی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ کسی ایک قوم یا ملک کی حد تک محدود نہیں رہا، بلکہ بد قسمتی سے تمام اقوام سے تعلق رکھنے والے جنگجوؤں میں سے کچھ یا ان کی ایک معتد بہ تعداد اس جرم میں شریک ہوتی ہے۔ اس کی وجہ بظاہر یہ ہے کہ مسلح تنازعات میں بچوں اور خواتین کے خلاف جنسی تشدد موجودہ دور کی جنگوں کا ایک افسوس ناک جنگی ہتھیار بن چکا ہے، جس کے پیچھے حملہ آور فریق کی یہ نفسیات کار فرما ہوتی ہے کہ اس سے مد مقابل کے اعصاب چٹخ جاتے ہیں اور یوں اسے جلد گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے[۳]۔ جنسی تشدد کی اس نفسیات کا علاج جب تک نہ کیا جائے تب تک اس کی روک تھام شاید ممکن نہ ہو۔

جنسی تشدد کی اس نفسیات کی روک تھام کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسا لائحہ عمل ترتیب دیا جائے کہ جنگ میں شریک فوجیوں اور جنگجوؤں کی نفسیات ایسی بن جائے کہ وہ دوران جنگ میں ان جرائم سے باز رہیں۔ مقالہ ہذا میں جنسی تشدد کی اس نفسیات کے انسداد کے لیے اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کیا جائے گا جس میں بنیادی طور پر یہ سوال زیر بحث ہو گا کہ کیا "اسلام

۱۔ ملاحظہ ہو یونیسیف کی رپورٹ: تقریر وضع الأطفال في العالم ۲۰۰۲، ۴۲؛ ملاحظہ ہو ایمنیسٹی انٹرنیشنل کی رپورٹ، ایرین خان https://www.amnesty.org/ar/latest/. (23/08/2022)

۲۔ یوکرائن کے صدر کی طرف سے بھی یہ دعویٰ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اقوام متحدہ کی نمائندہ خصوصی پرمیلا پیٹن نے بھی یوکرائن کے حالیہ دورے میں اس کا اظہار کیا ہے۔ https://news.un.org/ar/story/2022/06/1103892

۳۔ ایرین خان، مرجع سابق

میں مسلح تنازعات کے دوران میں جنسی تشدد کے تحفظ کے لیے کچھ تعلیمات موجود ہیں؟ نیز یہ تعلیمات موجودہ دور کے تناظر میں کس حد تک کارگر ثابت ہو سکتی ہیں"؟

جنسی تشدد کی تعریف

آگے بڑھنے سے پہلے جنسی تشدد کی مروجہ تعریف کو زیر بحث لانا اور اسلامی تناظر میں اس کی تنقیح کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے؛ تاکہ اس کے سدباب کے متعلق بحث متعین رخ پر آگے بڑھ سکے۔ جنسی تشدد کی مختلف تعریفات کی گئی ہیں، لیکن یہاں چونکہ مسلح تنازعات کے تناظر میں بات ہو رہی ہے، اس لیے اس وقت پیش نظر وہ تعریف ہے جو آئی سی آر سی کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر اور اس کی رپورٹوں میں ذکر کی جاتی ہے۔ یہ تعریف حسب ذیل ہے:

> Acts of sexual nature committed against any person by force, threat of force or coercion. It includes rape, sexual slavery, enforced prostitution, forced pregnancy and enforced sterilization or any other act of a sexual nature of comparable gravity.[1]

تعریف کا مختصر تجزیہ

اس تعریف میں چند امور ہیں:

۱۔ بالجبر جنسی تعلقات، (خواہ جبر کی جو صورت بھی ہو)

۲۔ جنسی غلامی (جنسی مقاصد کے لیے عورتوں کو قید کرنا/استعمال کرنا)

۳۔ جسم فروشی پر مجبور کرنا

۴۔ جبری حمل

۵۔ جبری بانجھ پن

۶۔ کسی بھی نوع کا جبری جنسی تعلق

1. ICRC Strategy on Sexual Violence 2018-2022, P#2.

اس تعریف میں جنسی تشدد کے اطلاق کے حوالے سے چونکہ خاصی تعمیم ہے؛ اس لیے مکمل طور پر یا منطق کی اصطلاح میں "کماھي" اتفاق کرنا مشکل ہے۔ باقی اسلام میں غیر عورت کے ساتھ ظاہر ہے بالجبر کیا بالرضا جنسی تعلق بھی ممنوع ہے۔ جسم فروشی بھی بالرضا ہو یا بالجبر وہ بھی ممنوع ہے۔ مسئلہ جبری حمل میں ہے؟ اگر کوئی منکوحہ خاتون حاملہ نہیں ہونا چاہتی اور اس کا خاوند اولاد چاہتا ہے تو اس عورت کو مانع حمل طریقے اختیار کرنے سے روکنا بھی جنسی تشدد کے زمرے میں آئے گا؟ یہ پہلو بحث طلب ہے۔ اپنے عموم میں شاید اسلامی نقطہ نظر سے ہم آہنگ نہ ہو۔ اسی طرح جبری بانجھ پن سے قطع نظر، اگر بانجھ پن یا وضع حمل اختیاری بھی ہو تو اسلام میں بغیر حاجت یا ضرورت اس کی عمومی اجازت نہیں۔

اگر ہم اسلامی لٹریچر کو دیکھیں تو ہمیں فقہ کی قدیم کتب میں کوئی ایسا باب نہیں ملے گا جو بطور خاص مسلح تنازعات میں جنسی تشدد سے متعلق ہو۔ نہ ہی یہ معاملہ بطور خاص فقہائے کرام کے ہاں زیر بحث رہا ہے (جس کی ایک خاص وجہ ہے جس پر آگے بات آئے گی) یہی وجہ ہے کہ ہمیں فقہ کی کتب میں جنسی تشدد کی کوئی لگی بندھی تعریف نہیں ملتی۔

اسلامی ادبیات میں جنسی تشدد کا مفہوم

اسلامی ادبیات میں جنسی تشدد کو مراودۃ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے اسلامی تصور بہت وسیع ہے۔ لسان العرب کے مطابق اس کا معنی ہے: کسی کے ساتھ جماع اور ہم آغوشی کی کوشش کرنا[1]۔ مفردات القرآن کے مؤلف کے مطابق اس سے مراد اپنی خواہش کو مسلط کرنا ہے،[2] جبکہ صاحب کشاف کے نزدیک اس میں دھوکہ دہی کا پہلو بھی شامل ہے جو کہ كذلك لنصرف عنه السوء والفحشاء سے بھی واضح ہے۔[3] یہاں قرآن کریم میں مراودۃ کی مزید

۱۔ ابن منظور افریقی، لسان العرب ۳: ۱۸۷

۲۔ راغب اصفہانی، مفردات القرآن، دمشق: دار القلم ۱: ۴۲۴؛ ۱: ۳۲۴

۳۔ زمخشری، الکشاف، بیروت: دار الکتاب العربی، ۱۴۰۷ھ، ۴: ۴۵۵

وضاحت السوء اور الفحشاء سے کی گئی ہے۔[۱] السوء کی بعض مفسرین نے یہ وضاحت کی ہے کہ اس سے مراد جنسی جملے کسنا[۲] اور دست درازی ہے، جبکہ الفحشاء سے مراد جسمانی ملاپ یعنی زنا ہے۔[۳] تاہم قرآن کی رو سے جنسی تشدد مرد و عورت دونوں کی طرف سے ہوتا ہے۔ یہ قطعاً ضروری نہیں کہ ہمیشہ خطاکار مرد ہی ہو بلکہ عورت بھی ایسا کر سکتی ہے، بالخصوص اگر اس کے پاس طاقت بھی ہو جیسا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے قصے سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ نیز خود مراودہ کے مفہوم میں بھی یہ بات داخل ہے جیسا کہ شاعر کہتا ہے:

أنا شيخ ولي امرأة عجوز تراودني على ما لا يجوز

تريد أنيكها في كل يوم وذلك عند أمثالي عزيز[۴]

مسلح تنازعات میں جنسی تشدد کی روک تھام میں اسلام کا اسلوب

اسلام میں چونکہ جنسی تعلقات کے حوالے سے حساسیت پائی جاتی ہے اور فقہ اسلامی کا قاعدہ کلیہ ہے کہ جنسی تعلق کے معاملے میں ممانعت اصل ہے، اس لیے نکاح کے علاوہ جنسی تعلق کی کوئی بھی صورت ہو اس کی گنجائش نہیں۔ اس سلسلے میں اسلام کا ایک پورا نظام ہے جس پر آئندہ صفحات میں بات آئے گی۔ سہولت کے لیے مسلح تنازعات میں جنسی تشدد کی روک تھام کے لیے اسلام کی تعلیمات کو درج ذیل تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

الف: جنسی تشدد کی نفسیات کی تربیت

ب: مسلح تنازعات میں جنسی تشدد کے انسداد کے لیے ہدایات

ج: دوران جنگ میں جنسی تشدد کی روک تھام کا میکانزم

۱۔ یوسف:۲۴

۲۔ نواب صدیق خان قنوجی، فتح البیان فی مقاصد القرآن، بیروت: المکتبۃ العصریۃ، ۱۴۱۲ھ، ۶: ۳۱۵

۳۔ رازی، ابو عبداللہ محمد بن عمر، مفاتیح الغیب، بیروت، دار احیاء التراث العربی، ۱۴۲۰ھ، ۱۲، ۲۲۸

۴۔ ابن عبد ربہ، العقد الفرید ۴: ۶۴

الف: جنسی تشدد کی نفسیات کی تربیت

اسلام کی رو سے انسانی عزت و شرف کا تحفظ شریعت کے بنیادی مقاصد میں سے ہے۔ کوئی ایسا کام جس سے کسی انسان کی حرمت پامال ہوتی ہو اس کے ارتکاب کی شریعت میں اجازت نہیں۔ یہ ایک بنیادی ضابطہ ہے جس کا تعلق حالت امن اور جنگ دونوں کے ساتھ ہے۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ شریعت اسلامیہ کو انسانی جذبات اور شہوات کا بھی ادراک ہے اور اس نفسیات کو قرآن کریم میں بہت خوبصورت انداز میں ذکر بھی کیا گیا ہے۔ سورۃ آل عمران میں ہے: ﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاء وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذَلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللهُ عِندَهُ حُسْنُ الْمَآبِ﴾ [آل عمران ۳: ۱۴] (لوگوں کے لیے آراستہ کی گئی ان خواہشوں کی محبت عورتیں اور بیٹے اور تلے اوپر سونے چاندی کے ڈھیر اور نشان کیے ہوئے گھوڑے اور چوپائے اور کھیتی، یہ جیتی دنیا کی پونجی ہے اور اللہ ہے جس کے پاس اچھا ٹھکانا ہے)۔

اس آیت میں تقریباً وہ تمام چیزیں بیان کی گئی ہیں جن کی خاطر انسان جنگ میں کودتا ہے اور ان کے حصول کے لیے اپنی آخری توانیاں تک صرف کر دیتا ہے؛ تاہم یہ تمام امور شرعی طور پر اس کے لیے تبھی حلال ہوسکتے ہیں جب وہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کا خیال رکھے۔ خواتین کے متعلق اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حد یہ ہے کہ اس کا جنسی تعلق صرف اپنی منکوحہ یا ملک یمین سے ہو۔[1] موجودہ دور میں تو ملک یمین کا امکان نہیں اس لیے یہ صرف منکوحہ تک محدود ہو گا۔ اس کے علاوہ کسی خاتون کے ساتھ کسی بھی نوع کا جنسی تعلق جائز نہیں ہو گا۔ تاہم چونکہ انسان کی نفسیات میں جنس مخالف کی طرف میلان رکھا گیا ہے اور اس وقت اس کی شدت میں اضافہ ہو جاتا ہے جب انسان کا پورا اختیار چل رہا ہو اور فریق ثانی بے بس بلکہ ایک طرح اس کے رحم

۱۔ المؤمنون: ۷

وکرم پر ہو۔ ایسی حالت میں کسی بھی نوعیت کی جنسی تعدی سے انسان اسی وقت بچ سکتا ہے جب اس کی تربیت درج ذیل قرآنی خطوط پر استوار ہو:

ا۔ غض بصر اور عفاف

قرآن کریم نے مردوں اور عورتوں کو پابند بنایا ہے کہ وہ بلا ضرورت ایک دوسرے کو نہ دیکھیں؛ بالخصوص شہوت کی نظر سے دیکھنے کی گنجائش نہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ ذَلِكَ أَزْكَى لَهُمْ إِنَّ اللهَ خَبِيرٌ بِمَا يَصْنَعُونَ﴾ [النور۲۴: ۳۰] (مسلمان مردوں کو حکم دو کہ اپنی نگاہیں کچھ نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ ہے، بے شک اللہ ان کے کاموں سے خبر دار ہے)۔

پھر یہ حکم کسی خاص حالت کا نہیں بلکہ ہر وقت اس کی پابندی ضروری ہے۔ نیز یہ حکم مسلمان مرد وعورت کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ مسلمان اور غیر مسلم برابر ہیں۔ چنانچہ اس آیت کی وضاحت میں رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے: لا ينظر الرجل إلى عورة الرجل، ولا المرأة إلى عورة المرأة، ولا يفضي الرجل إلى الرجل في ثوب واحد، ولا تفضي المرأة إلى المرأة في ثوب واحد[1] (کوئی مرد کسی مرد کے ستر کو نہ دیکھے اور نہ کوئی عورت کسی عورت کے ستر کو دیکھے۔ مرد مرد کے ساتھ ایک کپڑے میں نہ ہو اور نہ عورت، عورت کے ساتھ ایک کپڑے میں ہو)۔

اگر نفسانی خواہشات حالت اعتدال سے متجاوز ہیں تو جلد نکاح کرنے کا حکم دیا گیا ہے؛ تاہم اگر کسی وجہ سے یہ ممکن نہیں تو پھر عفت وپاک دامنی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے: ﴿وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحاً حَتَّى يُغْنِيَهُمْ اللهُ مِن فَضْلِهِ﴾ [النور۲۴: ۳۳] (جو

۱۔ صحیح مسلم، حدیث نمبر ۷۶۸

نکاح کے وسائل نہیں پاتے انہیں چاہیے کہ وہ پاک دامنی اختیار کریں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ انہیں غنی کر دے)۔

۲۔ جنگ کا مقصد: اعلاء کلمۃ اللہ

چونکہ مال و دولت اور انسان کی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کی کوشش انسانی نفسیات کا حصہ ہے، لہٰذا یہ ممکن تھا کہ بعض لوگ اس مقصد کے لیے جنگ میں شریک ہوتے، تو ایسے لوگوں کو بھی وضاحت سے بتا دیا گیا کہ اپنی نیتیں درست کریں۔ جہاد میں صرف اسی شخص کو شرکت کی اجازت ہے جس کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ ہو۔ چنانچہ قرآن کریم میں جہاں جہاد کی اجازت دی گئی ہے وہاں اس کے مقاصد بھی بتا دیے گئے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلهِ عَاقِبَةُ الأُمُورِ﴾ [الحج ۲۲: ۴۱] (وہ لوگ کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار دیں تو نماز قائم رکھیں اور زکاۃ دیں اور بھلائی کا حکم کریں اور برائی سے روکیں اور اللہ ہی کے قبضے میں سب کاموں کا انجام ہے)۔

اس آیت میں جہاد کا مقصد واضح ہے۔ وہ شخص جو جنسی آلودگیوں سے پاک نہ ہو اور اس کے سامنے دنیوی مال و متاع یا کوئی بھی دوسرا مقصد ہو، جو اس قرآنی مطلوب سے ہم آہنگ نہ ہو تو اصولی طور پر اسے جہاد میں شریک ہونے کی اجازت نہیں۔ اس آیت سے یہ بھی واضح ہوا کہ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت کو قائم کرنا ہے ان کے پیچھے غیر معمولی اخلاقی قوت ہونی چاہیے؛ تاکہ وہ جب کسی علاقے پر قابض ہوں تو مقبوضہ علاقے کے لوگوں کو دین کی طرف دعوت دے سکیں اور کوئی بھی دنیاوی مفاد ان کا مطمح نظر نہ ہو۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ سے ایک موقع پر اس بارے میں سوال بھی کیا گیا۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے: أن رجلا أعرابيا أتى النبي صلى الله عليه وسلم، فقال: يارسول الله، الرجل يقاتل للمغنم، والرجل يقاتل ليذكر، والرجل يقاتل ليرى مكانه. فمن في سبيل الله؟ فقال رسول

الله صلى الله عليه وسلم: من قاتل لتكون كلمة الله أعلى، فهو في سبيل الله[1] (ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور اس نے پوچھا، ایک بندہ مال غنیمت کے حصول کے لیے جہاد کرتا ہے، اور ایک بندہ اس لیے جہاد میں شامل ہوتا ہے کہ اس کا تذکرہ کیا جائے، اور ایک بندہ اس لیے قتال کرتا ہے کہ وہ اپنا مقام و مرتبہ پہچان لے تو ان میں سے اللہ کے راستے میں کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے راستے میں وہ ہے جو اس مقصد کے لیے قتال کرے کہ اللہ کا دین سر بلند ہو)۔

مندرجہ بالا حدیث اور آیت سے اسلام کی جنگی نفسیات واضح ہوتی ہے، وہ یہ کہ اسلام کا جنگ سے ایک خاص مقصد ہے جس کے لیے نیت اور جہت کا درست ہونا ضروری ہے۔ اگر کسی شخص کے پیش نظر اس کے علاوہ کوئی مقصد ہے تو اصولی طور پر وہ جہاد فی سبیل اللہ میں شامل نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ دین اسلام کی سربلندی کے لیے جہاد میں شریک ہوں گے وہ کسی ایسے کام میں مبتلا نہیں ہوں گے جو اس مقصد کے منافی ہو۔

جب مقاتلین اس تربیت کے ساتھ میدان میں اتریں گے تو ظاہر ہے وہ نفسانی خواہشات کے لیے کسی خاتون پر زیادتی کرنے کی بجائے استعفاف اور غض بصر سے کام لیں گے۔ تاہم چونکہ انسانی کمزوری اور خواہش نفس کے غلبے کے امکانات موجود تھے، اس لیے میدان جنگ میں اس سے بچنے کے لیے واضح ہدایات کے ساتھ ایک پورا میکانزم دیا گیا، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

ب: مسلح تنازعات میں جنسی تشدد کے انسداد کے لیے ہدایات

یہاں ایک بات کی وضاحت کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ چونکہ جنگیں تو ہر دور میں ہی رہی ہیں، جنسی تشدد کا پہلو بھی ان میں ہمیشہ سے ہی رہا ہے، امن کا وقفہ بہت کم رہا ہے، بلکہ بعض محققین کے نزدیک تو معلوم انسانی تاریخ میں مکمل امن کے کل دو سو پچاس برس ہی بنتے ہیں۔

۱۔ صحیح مسلم، حدیث ۴۳۱۰

لیکن جس طرح آج مسلح تنازعات میں جنسی تشدد نے ایک جنگی حربے کی حیثیت اختیار کرلی ہے، ماضی میں شاید ایسا نہیں تھا۔ ایک رپورٹ کے مطابق ماضی میں جنگوں کے دوران کام آنے والے نوے فیصد لوگ فوجی اور دس فیصد "عام شہری، عورتیں اور بچے" ہوتے تھے، جبکہ موجودہ دور میں صورت حال اس کے برعکس ہے۔ آج نوے فیصد عام شہری جن میں بچے اور عورتیں شامل ہیں، جنگ کی تباہ کاری کا نشانہ بنتے ہیں۔ اس لیے آج کے دور میں جنسی تشدد کے عنوان سے قوانین اور احکام لکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، لیکن آج سے ڈیڑھ ہزار برس قبل شاید یہ صورت حال نہیں تھی یا کم از کم اسلامی افواج کی طرف سے ایسے واقعات قابل ذکر تعداد میں سامنے نہیں آتے تھے؛ اس لیے اس عنوان پر کلاسیکی فقہی لٹریچر میں ہمیں ابواب اور فصول نہیں ملتیں؛ تاہم شارع کی نظر میں یہ معاملہ اتنا غیر اہم بھی نہیں تھا کہ اس کے متعلق اصولی ہدایات نہ دی جاتیں۔ چنانچہ جب ہم اسلامی آداب القتال کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ شارع کے سامنے یہ پہلو بھی پوری اہمیت کے ساتھ موجود ہے۔ اس سلسلے میں چند مثالیں حسب ذیل ہیں:

(۱) تعدّی کی ممانعت

قرآن کریم میں قتال کے آداب کے ضمن میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے: ﴿وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلا تَعْتَدُوا إِنَّ اللهَ لا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ﴾ [البقرۃ۲: ۱۹۰] (اور اللہ کی راہ میں لڑو ان سے جو تم سے لڑتے ہیں اور حد سے نہ بڑھو اللہ پسند نہیں رکھتا حد سے بڑھنے والوں کو)۔

طبری کے مطابق قتال کے متعلق یہ سب سے پہلی آیت ہے[۱]۔ یہاں تعدی سے منع کیا گیا ہے۔ جس سے مراد ہے قتال کے دوران میں یا اس کے بعد خواتین اور بچوں سے تعرض نہ کرنا۔

۱۔ طبری، محمد بن جریر، جامع البیان فی تاویل القرآن، بیروت: مؤسسۃ الرسالۃ، ۱۴۲۰، ۳: ۵۶۱

چنانچہ حضرت عمر بن عبد العزیز سے موصل کے گورنر یحییٰ بن یحییٰ الغسانی نے لَا تَعْتَدُوْا کے مفہوم کے بارے میں پوچھا تو آپ نے جواب بھیجا کہ یہ خواتین، بچوں اور ان لوگوں سے متعلق ہے جو تم سے جنگ نہیں کرتے[۱]۔ آپ نے عدی بن ارطاۃ کو بھی اسی مفہوم کا خط لکھا کہ عورتوں، بچوں اور راہبوں سے قتال حرام ہے۔[۲] اگر لَا تَعْتَدُوْا کے صیغے کو دیکھا جائے تو اس کے تحت ہر طرح کی تعدی شامل ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ابن کثیر نے اس کے تحت "مناکیر الامور" کی ممانعت کا ذکر کیا ہے[۳]، یعنی کوئی بھی ایسا کام جو اخلاق سلیمہ سے ہٹا ہوا ہو جنگ کے دوران میں بھی ممنوع ہو گا۔

(۲) جیش اسامہ کو ہدایت

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب حضرت اسامہ بن زیدؓ کی سرکردگی میں شام کی طرف لشکر روانہ کیا تو اس لشکر کے سپاہیوں کو جو ہدایات جاری کیں ان میں یہ ہدایت بھی شامل تھی: لا تقتلوا امرأةً، ولا صبيًّا، ولا كبيرًا هَرمًا، ولا تقطعوا شجَرًا مُثمرًا، ولا تُخرِّبُنَّ عامرًا، ولا تَعقرنَّ شاةً ولا بعيرًا إلَّا لمأكلة.[۴] (تم کسی عورت یا بچے یا بوڑھے کو قتل نہ کرو، اور پھل دار درخت نہ کاٹو، اور کسی عمارت کو نہ گراؤ، اور کسی بھیڑ یا اونٹ کو سوائے کھانے کے ذبح نہ کرو)۔

۱۔ طبری مرجع سابق، ۳: ۵۶۲

۲۔ مرجع سابق

۳۔ ابن کثیر کے اصل الفاظ ہیں: وَيَدْخُلُ فِي ذَلِكَ ارْتِكَابُ الْمَنَاهِي ملاحظہ ہو: ابن کثیر، ابو الفداء اسماعیل بن عمر، تفسیر القرآن العظیم، بیروت: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۹ھ، ۱: ۳۸۷

۴۔ ابن کثیر، ابو الفداء اسماعیل بن عمر، إرشاد الفقیہ إلی معرفۃ أدلۃ التنبیہ، بیروت: مؤسسۃ الرسالۃ ۲: ۳۲۰

(۳) حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہدایت

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بھی لشکر کو ہدایت منقول ہے جو اس حوالے سے نسبتاً زیادہ واضح محسوس ہوتی ہے: لا تهجموا النساء بأذى وإن شتمن أعراضكم وسبين أمراءكم[۱] (خواتین کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچاؤ اگرچہ وہ تمہیں اور تمہارے امراء کو سب وشتم کریں)۔ یہ فرمان بالکل واضح ہے کہ خواتین کی طرف سے دوران جنگ میں اگر زبانی مڈبھیڑ ہو بھی جائے تو ان کو تکلیف نہیں پہنچانی، الاّ یہ کہ وہ حملہ آور ہو جائیں۔

(۴) رسول اللہ ﷺ کا معمول

بعض روایات کے مجموعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ معمول تھا کہ آپ دوران جنگ میں اور جنگ کے اختتام پر باقاعدہ میدان جنگ میں موجود مقتولین کا جائزہ لیتے تھے۔ اس موقع پر جنگ کے متعلق دی گئی ہدایات کی خلاف ورزی پر باز پرس بھی کی جاتی تھی۔ عہد رسالت کی کئی جنگوں کے متعلق کتب سیرت و تاریخ میں ایسے کئی واقعات ملتے ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ نے خواتین کو نشانہ بنانے پر باز پرس کی۔ اس سلسلے میں دو واقعات حسب ذیل ہیں:

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے: أن النبي صلى الله عليه وسلم مر بامرأة يوم الخندق مقتولة فقال من قتل هذه فقال رجل: أنا يا رسول اللهﷺ، قال: ولم؟ قال: نازعتني سيفي، فسكت[۲] (غزوہ خندق کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کا ایک مقتولہ عورت کے پاس سے گزر ہوا تو آپ نے پوچھا کہ اسے کس نے قتل کر دیا؟ ایک آدمی نے بتایا کہ یا رسول اللہ میں نے! آپ نے پوچھا کہ کیوں؟ اس نے کہا کہ یہ مجھ سے تلوار چھیننے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ سن کر آپ نے خاموشی اختیار کی)۔

۱۔ نہج البلاغۃ ۳: ۱۵

۲۔ طبرانی، المعجم الکبیر ۱۱: ۳۸۸

اسی طرح کا ایک واقعہ غزوہ خیبر اور طائف میں بھی پیش آیا۔ خیبر والا واقعہ عبد الرحمان بن ابی عمرۃ سے ان الفاظ میں مروی ہے: مر رسول الله صلى الله عليه وسلم على امرأة مقتولة يوم خيبر، فقال: من قتل هذه؟ فقال رجل: أنا يا رسول الله، أردفتها خلفي فأرادت قتلي فدفيتها، فأمر رسول الله بدفنها[1] (غزوہ خیبر کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کا ایک مقتولہ عورت کے پاس سے گزر ہوا تو آپ نے پوچھا کہ اسے کس نے قتل کر دیا؟ ایک آدمی نے کہا کہ اسے میں نے پیچھے بٹھا لیا تھا، لیکن اس نے مجھے قتل کرنا چاہا تو میں نے اس کا خاتمہ کر دیا، یہ سن کر رسول اللہ نے اس عورت کو دفن کرنے کا حکم دیا)۔

ان واقعات سے یہ بات واضح ہے کہ ان صحابیوں نے خواتین کو اس وقت تک کچھ نہیں کہا جب تک انہوں نے باقاعدہ حملہ آور ہونے کی کوشش نہیں کی۔ رسول اللہ ﷺ نے باز پرس بھی اسی وجہ سے کی کہ خواتین کو نشانہ بنانے کی تو ممانعت ہے، پھر یہ کام کیسے کیا گیا، جب آپ کو بتایا گیا کہ خاتون نے حملہ کرنے کی کوشش کی تو انکوائری ختم کر دی گئی کہ اب بظاہر تفتیش کا جواز ختم ہو گیا تھا۔

(۵) معاہدات کی خلاف ورزی کی ممانعت

اسلام نے دوران جنگ میں معاہدات اور عہد کی خلاف ورزی سے تاکید کے ساتھ منع کیا ہے۔ خواہ یہ عہد جنگ کے دوران میں کیا گیا ہو یا جنگ سے پہلے آداب القتال کے حوالے سے کچھ اصول اور قول و قرار پر اتفاق کیا گیا ہو۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کے دور میں جتنے لشکر کسی جنگ کے لیے روانہ کیے گئے ان سب کو عہد کی پاس داری اور اس کی خلاف ورزی سے باز رہنے کی تاکید کی گئی۔

اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے خلفاء کا معمول یہ تھا کہ جنگ شروع ہونے سے پہلے یا لشکر روانہ کرتے وقت امیر لشکر کو ان ہدایات کی یاد دہانی کرائی جاتی؛ تاکہ اسلامی لشکر

۱۔ ابن حجر، المطالب العالیۃ ۶: ۱۸۲

فاتحین کی جبر و تسلط کی نفسیات کی بجائے اسلامی دعوت اور قیام امن وامان کی نیت سے مفتوحہ علاقوں میں داخل ہوں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے لشکر کے امراء کو درج ذیل تاکید کی جاتی تھی: اغزوا بسم الله في سبيل الله قاتلوا من كفر بالله، اغزوا ولا تغلوا ولا تغدروا ولا تمثلوا ولا تقتلوا وليدا[1] (اللہ کا نام لے کر جنگ کا آغاز کرو، کفار سے لڑائی کرو، خیانت اور دھوکہ دہی نہ کرو، مثلہ نہ کرو اور بچوں کو قتل نہ کرو)۔ دیگر خلفاء کی ہدایات و تاکیدات کتب سیر و مغازی کا حصہ اور عام معروف ہیں۔

قرآن کریم میں بھی جابجا عہد کی پاس داری کی تلقین کی گئی ہے، بلکہ عہد کی پاس داری کو مومنین کا خاص وصف قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۃ المؤمنون میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَالَّذِينَ هُمْ لأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ﴾ [المؤمنون ۲۳: ۸] (اور وہ جو اپنی امانتوں اور عہد کا پاس رکھنے والے ہیں)۔

موجودہ دور میں جنگ چونکہ ایک خاص بین الاقوامی میثاق اور قوانین کے تحت لڑی جاتی ہے، جن پر تقریباً تمام مسلم ممالک کا اتفاق ہے لہٰذا ان مواثیق اور قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کوئی بھی ایسا اقدام جو اس کی مخالفت پر مبنی ہو جائز نہیں ہو گا۔

ج۔ دوران جنگ میں جنسی تشدد کی روک تھام کا میکانزم

درج بالا عمومی ہدایات کے علاوہ جنسی تشدد کی روک تھام کا ایک پورا میکانزم بھی اسلام میں رکھا گیا ہے۔ چنانچہ جنسی تشدد کی جو صورتیں ہو سکتی ہیں ان کو باقاعدہ نام لے کر ان کا سدباب کیا گیا ہے۔ عام طور پر دوران جنگ میں یا اس کے بعد جنسی تشدد کی دو صورتیں ممکن ہیں:

۱۔ جنسی عبودیت (Sexual slavery)

۲۔ جنسی استحصال (Rape)

۱۔ طبرانی، المعجم الاوسط ۴: ۲۶۸

ا۔ جنسی عبودیت (Sexual slavery)

جنسی عبودیت سے مراد ہے کہ مقبوضہ علاقے کی خواتین کو جنسی مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے یا ان کا تبادلہ اور خرید و فروخت ہو جس میں بائع و مشتری کا مقصد جنسی استعمال ہو۔ جہاں تک جنسی عبودیت کا تعلق ہے تو اسلام کی رو سے دوران جنگ میں یا فتح کے بعد غیر مقاتلین سے تعرض کرنا منع ہے، بلکہ ان کے جان و مال کی حفاظت اسلامی لشکر کی ذمہ داری ہے۔ اگر جنگجو خواتین قید ہو جاتی ہیں تو ان کے لیے جنگی قیدیوں والے احکام ہیں اور موجودہ بین الاقوامی قانون کے تحت جلد یا بدیر انہیں رہا کرنا ہی ہو گا۔ اگر وہ جنگی جرائم میں ملوث ثابت ہوں تو باقاعدہ مقدمہ چلا کر سزا دی جائے گی۔

اگر کوئی مسلم ملک یا کوئی طاقت ور مسلح گروہ موجودہ بین الاقوامی معاہدات سے اپنے آپ کو الگ کرنے کا اعلان کرتے ہوئے اپنے مقبوضہ علاقوں میں غلامی کا طریقہ کار اختیار کرتا ہے جیسا کہ داعش کا آج کل موقف ہے تو بھی جنسی عبودیت کی گنجائش نہیں۔ اس لیے کہ باندیوں کو جنسی عبودیت کے لیے استعمال کرنے سے قرآن کریم میں واضح طور پر منع کیا گیا ہے۔ یہ طریقہ عربوں کے ہاں زمانہ جاہلیت میں رائج تھا کہ باندیوں کو مختلف مردوں کے ساتھ جنسی تعلق رکھنے پر مجبور کیا جاتا تھا اور اس مقصد کے لیے لوگ باندیوں کا باہم لین دین اور تبادلہ بھی کرتے تھے۔ قرآن کریم میں اس کام سے صراحتاً منع کرتے ہوئے کہا گیا: ﴿وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِتَبْتَغُوا عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَنْ يُكْرِهُّنَّ فَإِنَّ اللهَ مِنْ بَعْدِ إِكْرَاهِهِنَّ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ [النور ۲۴: ۳۳] (اور تمہاری لونڈیاں جو پاک دامن رہنا چاہتی ہیں انہیں دنیا کی زندگی کے فائدہ کی غرض سے زنا پر مجبور نہ کرو، اور جو انہیں مجبور کرے گا تو اللہ ان کے مجبور ہونے کے بعد بخشنے والا مہربان ہے)۔

تفسیر ابن کثیر میں اس آیت کے شان نزول کے تحت لکھا ہے: كان لأهل الجاهلية إذا كان لأحدهم أمة أرسلها تزني وجعل عليها ضريبة يأخذها منها كل وقت، فلما جاء

الإسلام نهى الله المؤمنين عن ذلك[۱] (اہل جاہلیت میں اگر کسی کے پاس باندی ہوتی تو وہ اسے زنا کرنے کے لیے دوسروں کے پاس بھیجتا اور اس پر کچھ ٹیکس بھی رکھتا تھا جو اس سے ایسے موقع پر وصول کیا جاتا تھا۔ جب اسلام کا دور آیا تو اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو اس سے منع کر دیا)۔

بعض مفسرین کے مطابق عبد اللہ بن ابی بن سلول بھی یہ کام کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اس کی ایک معاذہ نامی باندی نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے اس معاملے کی شکایت کی ۔ حضرت ابو بکر، یہ معاملہ رسول اللہ ﷺ کے علم میں لائے تو آپ نے اس باندی کو حفاظتی تحویل میں لینے کا حکم دیا جس پر عبد اللہ ابن ابی غضب ناک ہو کر چلانے لگا: من يعذرنا من محمد يغلبنا على مملوكتنا[۲] (محمد [ﷺ] سے ہمیں کون بچائے گا، ہماری زیر ملکیت باندی پر بھی قابض ہو گیا ہے)۔

ماضی قریب میں داعش کے زیر قبضہ علاقوں سے ذرائع ابلاغ پر ایک تواتر سے مندرجہ بالا نوعیت کی جنسی عبودیت کی خبریں آتی رہی ہیں۔ اس سلسلے میں داعش کا جو بھی استدلال ہو اسلام کی رو سے جنسی عبودیت کی کوئی گنجائش نہیں، خواہ یہ کام اجرت پر ہو یا اس کی کوئی بھی صورت ہو۔ اس پر حدود و تعزیرات کے اسلامی احکام نافذ ہوں گے۔ نیز یہ کام بعینہ اسی طرح شمار ہو گا جیسے منافقین اور مشرکین عرب کرتے تھے[۳]۔

۲۔ جنسی استحصال (Rape)

جنسی استحصال یا ریپ کی جیسے عام حالات میں اجازت نہیں ایسے ہی دوران جنگ یا اس کے بعد مقبوضہ علاقے کی خواتین کے ساتھ بھی گنجائش نہیں۔ مروج اسلامی اصطلاح میں اسے "اغتصاب" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس میں دونوں صورتیں داخل ہیں، یعنی کسی عورت سے

۱۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم ۶: ۵۱

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

زبردستی تعلق قائم کیا جائے یا اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھایا جائے۔[۱] حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں کا واقعہ ہے: وَأُتِيَ عُمَرُ بِإِمَاءٍ مِنْ إِمَاءِ الْإِمَارَةِ، اسْتَكْرَهَهُنَّ غِلْمَانٌ مِنْ غِلْمَانِ الْإِمَارَةِ، فَضَرَبَ الْغِلْمَانَ، وَلَمْ يَضْرِبْ الْإِمَاءَ[۲] (حضرت عمرؓ کے پاس باندیاں لائی گئیں جن کے ساتھ کچھ لڑکوں نے زبردستی جنسی تعلق قائم کیا تھا تو آپ نے لڑکوں پر حد جاری کی اور باندیوں کو کچھ نہیں کہا)۔

اسی طرح المغنی میں ایک اور واقعہ بھی ہے کہ ایک سوئی ہوئی باندی کے ساتھ کسی نے زنا کیا تو وہ حضرت عمرؓ کے پاس شکایت لے کر آئی۔ آپ نے اس عورت پر زنا کے جرم میں حد جاری نہیں کی بلکہ اسے مجبور قرار دے کر باز پرس نہیں کی۔[۳]

اس واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جب باندیوں کا دور تھا اس وقت بھی کسی باندی کے ساتھ ریپ کی گنجائش نہیں تھی، چہ جائیکہ اس نظام کے خاتمے پر مسلمانوں کا اجماع ہو جائے۔ ایسی صورت میں تو کوئی گنجائش بچتی ہی نہیں اور حد جاری کرنا لازم ہے[۴]۔

حاصل کلام

حاصل یہ کہ اسلام کی رو سے مسلح تنازعات کے دوران میں مد مقابل فریق کی خواتین کی جان و مال اور ان کی عزت و شرف سے تعرض کی گنجائش نہیں۔ اسلام نے اس سلسلے میں بچاؤ کے لیے نہ صرف ہدایات دیں، بلکہ اس نفسیات کو کنٹرول کرنے کے لیے تربیت کا پورا نظام بھی متعارف کروایا۔ نیز چونکہ اسلام کی رو سے جنگ ایک ناپسندیدہ ضرورت ہے اور اس کا جواز صرف

۱۔ کاسانی، بدائع الصنائع، ۷: ۳۳؛ شیرازی، المہذب ۲: ۳۴۰

۲۔ ابن قدامہ، المغنی ۹: ۵۹

۳۔ ایضاً

۴۔ سرخسی، المبسوط، بیروت: دار المعرفۃ، ۱۹۸۹ء، ۹: ۱۱۸

اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ہے؛ اس لیے جنگ میں ایک مسلمان جنگجو کے پیش نظر دعوت دین کا مقصد ہر وقت پیش نظر رہنا چاہیے۔

حالت جنگ میں جنسی تشدد: اسلامی تعلیمات

ڈاکٹر محسن نقوی*

دنیا کی معلوم تاریخ سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ جنگ میں فاتح قوم مفتوح قوم کی عورتوں، لڑکیوں اور بچوں کو اپنا مال سمجھتی تھی اور ان سے بدترین جنسی سلوک کرنا گویا فاتح قوم کی قوت و طاقت ظاہر کرنے کا بہترین ذریعہ تھا۔ قرآن مجید میں ملکہ سبا کی زبانی اسی رسم کو بیان کیا گیا ہے: ﴿قَالَتْ إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً وَكَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ﴾ [النمل ۲۷: ۳۴] (ملکہ نے کہا کہ جب بادشاہ کسی علاقے میں داخل ہوتے ہیں تو اسے فاسد کر دیتے ہیں، اور اس کے صاحبان عزت کو ذلیل کر کے رکھ دیتے ہیں، اور وہ ایسا ہی کرتے ہیں)۔ اس ایک جملے میں اس دور کی ملوکیت کی پوری کہانی سنا دی گئی ہے۔ اس مفسدہ کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ مفتوح قوم کے مردوں اور بچوں کو ذبح کر دیا جاتا تھا، جب کہ ان کی عورتوں کو گھریلو اور جنسی مقاصد کے لیے زندہ رکھا جاتا تھا۔ جیسا کہ قرآن مجید کی متعدد آیات میں وارد ہوا ہے۔ (البقرۃ ۲: ۴۹؛ الاعراف ۷: ۱۴۱؛ ابراہیم ۱۴: ۶)

تاریخِ عالم کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ دنیا میں زیادہ تر معاشرے پدرسری رہے ہیں، بہت کم معاشروں میں مدرسری نظام رہا ہے، ان میں بھی عورت کا بڑا بھائی اختیارات استعمال کیا کرتا تھا۔ بادشاہوں اور جاگیر داروں کے حرم میں صدہا عورتیں ہوتی تھیں۔ علم بشریات کے بعض ماہرین کا خیال ہے کہ کثرتِ ازدواج کا رواج بھی قوموں میں اسی طرز فکر کا غماز ہے۔ لونڈیوں اور کنیزوں کی کوئی تعداد مقرر نہیں تھی۔ ان سب کے پیچھے جنسی تسکین کا حصول، خدمت گزاری اور دوسرے افراد و قوموں پر تفاخر تھا۔ عورت ایک جنسِ تجارت ہوا کرتی تھی؛ لہٰذا اسے خریدنے والے کو اس پر حالت امن اور حالت جنگ دونوں میں پورا اختیار حاصل تھا۔

---

* مذہبی سکالر

اسلام میں انسانی عزت کی اہمیت

اس پس منظر میں اصل بحث یہاں سے شروع ہونی چاہیے کہ اسلام میں انسان یعنی مرد و عورت کی عصمت، اس کی جان اور مال کے ساتھ ساتھ کتنی اہمیت کی حامل ہے؟ کیا اسے کسی غیر معمولی صورت حال میں نقصان پہنچایا جا سکتا ہے یا نہیں؟ خواہ یہ غیر معمولی حالات، آپس کی نبرد آزمائی سے پیدا ہوئے ہوں یا پھر غیروں سے جنگ کی صورت میں نمو دار ہوئے ہوں۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے "عصمت انسانی" کو کسی حالت میں بھی نقصان نہیں پہنچایا جا سکتا۔ اسلام بنیادی طور پر اللہ کی طرف سے شرف انسانی کی تعلیم دیتا ہے جیسا کہ متعدد آیات میں بھی وارد ہے۔

۱۔ ﴿فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ﴾ [الحجر ۱۵: ۲۹؛ ص ۳۸: ۷۲] (جب میں اس [آدم] کا تسویہ کرلوں اور میں اس میں اپنی روح پھونک دوں۔ تو اس کی عظمت کے اعتراف میں سرنگوں ہو جانا)۔

۲۔ ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ﴾ [التین ۹۵: ۴] (یقیناً ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا)۔

۳۔ ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلا﴾ [الاسراء ۱۷: ۷۰] (ہم نے آدم کی اولاد کو مکرم بنایا، اور انھیں خشکی و بحری راستوں میں سواریاں دیں، نیز انھیں کھانے کے لیے پاکیزہ غذائیں عطا کیں، اور جو کچھ مخلوق ہم نے پیدا کی ہے ان میں سے اکثر پر انھیں فضیلت دی)۔

ایسی ہی بہت سی آیات ہیں جن میں انسان کی اصالت پر گفتگو کی گئی ہے اور اسے بطور مخلوق الٰہی کے شرف اور فضیلت کو جزوی یا کلی طور پر بیان فرمایا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے ہر انسان محترم و مکرم ہے، اس کی جان و مال، عزت و آبرو، اور اس کا نظریہ بھی محترم ہے۔ قرآن مجید میں "دین" کی اصطلاح پر غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے راستے کے لیے بھی استعمال ہوئی ہے اور معاشرتی رواج و قانون کے لیے بھی۔ چند مقامات ملاحظہ ہوں۔

۱۔﴿لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ﴾ [الکافرون۱۰۹: ۶] (اے کافرو! تمہارے لیے تمہارا ضابطہ اور میرے لیے میرا دین)۔

۲۔ ﴿مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ﴾ [یوسف۱۲: ۷۶] (جب کہ بادشاہ کے قانون میں حضرت یوسف کبھی اپنے بھائی کو نہ حاصل کر پاتے)۔

۳۔ ﴿لا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ﴾ [البقرۃ۲: ۲۵۶] (دین کو اختیار کرنے کے معاملے میں کسی پر کوئی جبر نہیں)۔

یعنی چاہے تو اسلام کو بطور ضابطہ حیات مانے یا نہ مانتے ہوئے کسی دوسرے ضابطے پر چلتا رہے۔ لیکن جب اسلام کو مان لیا تو پھر اس کے قانون کو توڑا نہیں جا سکتا۔

اس لحاظ سے دین اسلام دیگر ادیان کو بھی تحفظ فراہم کرتا ہے اور ان پر کسی قسم کا جبر روا نہیں رکھتا، اسی لیے اسلام میں غیر مسلموں کی جان و مال، عزت و آبرو، نیز ان کے عقیدے کو تحفظ دیا گیا ہے، اور ان کی مناکحت کو جائز نیز اولاد کو صحیح النسب مانا گیا ہے۔ یہ امر دیگر آیات کے علاوہ قرآن مجید کی اصطلاح "رب العالمین" سے واضح ہے، نیز یہ امر ان آیات سے واضح ہوتا ہے جن میں سے ایک میں نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے لیے فرمایا: ﴿لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا﴾ [الفرقان۲۵: ۱] یعنی آپ کو تمام عالمین کے لیے خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا، اور دوسرے اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلا رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ﴾ [الفرقان۲۱: ۱۰۷] یعنی آپ کو تمام عالمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا۔ ان دونوں آیات میں بھی کسی قسم کی تفریق نہیں رکھی گئی ہے اور یہی شریعت کا عمومی مزاج ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا﴾ [الاعراف۷: ۱۵۸] (اے رسول ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ میں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں)۔ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی پاکیزہ تعلیمات بلا تفریق مذہب و ملت، رنگ و نسل سب کے لیے ہیں، اور اصالت شرف میں سب ہی برابر ہیں۔

قرآن مجید کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ شریعت کے پانچ بڑے بڑے مقاصد ہیں جنہیں علما نے مقاصد شریعت کے عنوان سے بیان کیا ہے، یعنی تحفظ دین، تحفظ جان، تحفظ مال، تحفظ عرض و نسل، اور تحفظ عقل۔ یہ مقاصد اسلام صرف مسلمانوں کے لیے ہی حاصل نہیں کرنا چاہتا، بلکہ معاشرے کے تمام طبقات بلا امتیاز رنگ و نسل، دین و مذہب اس میں شامل ہیں، جب تک کہ وہ اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت کے مرتکب نہ ہوں؛ جس کی صورت محاربہ ہے یا پھر غیروں سے جنگ۔ ہم ان دونوں صورتوں کے احکام علاحدہ علاحدہ بیان کرتے ہیں کہ ان میں جنسی تشدد یا جنسی جرائم کے اثرات کیسے مرتب ہوں گے۔ ایک اصولی امر یہ ہے کہ غیر مسلم عورتوں کی عصمت کا تحفظ کیا جائے گا خواہ ان کی قوم مسلمانوں کے ساتھ حالت جنگ میں ہو یا نہ ہو۔

یہاں دو امور ذکر کرنے ضروری ہیں: ایک تو یہ کہ غزوات میں صحابہ کرامؓ اپنی زوجات میں سے کسی کو ہمراہ لے جاتے تھے؛ تاکہ دوسری عورتوں کی طرف بے رغبتی رہے، دوسرے یہ کہ غزوہ تبوک کے موقع پر بعض منافقین آپ کے ساتھ نہیں جانا چاہتے تھے، چنانچہ انھوں نے کئی عذر پیش کیے۔ ان میں سے ایک جد بن قیس کا واقعہ دل چسپ ہے۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا: یارسول اللہ! وہاں گوری چمڑی والی عورتیں ہوں گی اور دنیا جانتی ہے کہ میں عورتوں کے معاملے میں اپنے نفس پر قابو نہیں رکھ سکتا، لہٰذا مجھے وہاں جانے سے معاف فرمایئے۔ آنحضرت نے اسے وہیں ٹھہرنے کی اجازت دے دی۔[1] اس واقعہ سے پتا چلتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے پسند نہیں کیا کہ کوئی بظاہر مسلمان ہی سہی، وہ کسی غیر مسلم عورت کی عزت برباد کرے اور کسی ایسے جنسی عمل میں مبتلا ہو جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔

محاربہ میں جنسی تشدد کے احکام

اسلام میں محاربے کی صورت میں بہت سخت سزائیں اور احکام دیے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے: ﴿إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الأَرْضِ فَسَادًا أَنْ

۱۔ تفسیر الطبری ۱۰: ۱۴۸، ۱۴۹؛ بیہقی، الدلائل ۵: ۲۱۳- ۲۱۴؛ طبرانی، الکبیر، ۲۱۵۴، ۱۲۶۵۴؛ ہیثمی، مجمع الزوائد ۷: ۱۳۰

يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الأَرْضِ﴾ [المائدۃ۵: ۳۳] (جولوگ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوششیں کرتے ہیں، ان کی سزا یہی ہے کہ ان کو بری طرح قتل کیا جائے، یا انھیں سولی پر چڑھا دیا جائے، یا ان کے ہاتھ و پیر مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں، یا پھر انھیں جلاوطن کر دیا جائے)۔

آیت حرابہ [المائدۃ۵: ۳۳] کو زیادہ تر ڈاکوؤں اور آبادیوں سے دور، جہاں مدد طلب کرنے والوں کی آواز نہ پہنچ سکے، وارداتیں کرنے والوں سے متعلق قرار دیا گیا ہے۔ یہ سمجھا گیا کہ اس زمانے کے لحاظ سے آبادیوں میں اس قسم کی کارروائیاں کرنا بعید از قیاس ہے، ایک تو وہاں بہر حال حکومت موجود ہوتی ہے، پھر قبائلی نظام کی مدد بھی حاصل ہوتی ہے، لہذا ایسا عمل آبادیوں سے دور بدوؤں یا خانہ بدوشوں کے ساتھ پیش آسکتا ہے۔ عند أكثر الفقهاء هي البروز لأخذ مال، أو لقتل، أو لإرعاب على سبيل المجاهرة مكابرة، اعتمادا على القوة مع البعد عن الغوث[1] (اکثر فقہا کے نزدیک یہ کسی گروہ کا باہر نکلنا ہے تاکہ وہ لوگوں کا مال چھین سکے یا لوگوں کو قتل کر سکے، یا پھر لوگوں میں رعب پیدا کرے، یہ لوگ اپنی قوت پر بھروسا کرتے ہیں اور کھلے طور اس قسم کی کارروائیاں کرتے ہیں، یہ کام وہ ایسی جگہ کرتے ہیں جہاں مدد کو پکارنے والوں کی پکار سنی نہ جاسکتی ہو)۔

مالکی فقہا نے اس میں عرض یعنی عزت پر حملہ آوری کو بھی شامل کیا ہے۔ ابن سحنون نے المدونۃ میں لکھا ہے: ومن كابر رجلاً بسلاح أو غيره على ماله في زقاق، أو دخل عليه حريمه في المصر، حكم عليه بحكم الحرابة[2] (جس نے کسی شخص کے مال پر دست درازی کی اپنے اسلحے سے یا کسی اور چیز سے، تنگ راستوں میں، یا پھر وہ شہر میں کسی کے گھر میں گھس گیا جہاں کسی کی ناموس رہتی ہو تو اس پر حرابہ کا اطلاق ہو گا)۔

۱۔ بدائع الصنائع ۷: ۹۰؛ روض الطالب ۴: ۱۵۴؛ الإقناع في حل ألفاظ أبي شجاع ۲: ۲۳۸؛ المغنی ۱۲: ۳۵۲

۲۔ المدونۃ الکبری ۴: ۵۵۲؛ جواہر الإکلیل ۲: ۲۹۴

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایسے لوگوں کو ملت سے خارج قرار دیا ہے: من حمل علينا السلاح فليس منا[۱] (جو ہتھیاروں کے ساتھ ہم پر حملہ آور ہوا وہ ہم میں سے نہیں)۔ آیت حرابہ اور اس حدیث کو ملا کر پڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور مسلمانوں پر حملہ آور ہونا در اصل اللہ سے جنگ ہے، کیوں کہ اللہ سے براہ راست جنگ نہیں کی جاسکتی۔ یہ اسی طرح ہے جیسے بیعت رضوان کے متعلق فرمایا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللهَ﴾ [الفتح۴۸: ۱۰] (جو لوگ آپ کی بیعت کر رہے ہیں وہ محض اللہ کی بیعت کر رہے ہیں)۔ نیز یہ کہ یہاں اللہ کا ذکر ان امور کی بڑائی اور شدت کو ظاہر کرتا ہے۔[۲] آیۃ اللہ ناصر مکارم شیرازی اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

إنّ المراد جملة الَّذِينَ يُحارِبُونَ اللهَ وَرَسُولَهُ الواردة في الآية- كما تشير إليه أحاديث أهل البيت ويدل عليه سبب نزول الآية- هو ارتكاب العدوان ضد أرواح أو أموال الناس باستخدام السلاح والتهديد به، سواء كان هذا العدوان من قبل قطاع الطرق خارج المدن أو داخلها، وعلى هذا الأساس فإن الآية تشمل أيضا الأشرار الذين يعتدون على أرواح الناس وأموالهم ونواميسهم. والذي يلفت الانتباه في هذه الآية هو أنّها اعتبرت العدوان الممارس ضد البشر بمثابة إعلان الحرب وممارسة العدوان ضد اللهّ ورسوله، وهذه النقطة تبيّن بل تثبت مدى اهتمام الإسلام العظيم بحقوق البشر ورعاية أمنهم وسلامتهم.[۳]

۱۔ بخاری ۶۸۷۴، ۷۰۷۰، ۷۰۷۱؛ مسلم ۹۸، ۱۰۰

۲۔ امام عمر بن علی ابن عادل الحنبلی، تفسیر اللباب فی علوم الکتاب ۷: ۳۰۳

۳۔ ناصر مکارم الشیرازی، التفسیر الأمثل ۳: ۶۸۳

اس آیت مبارکہ میں جو الفاظ آئے ہیں "جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں" اس کے بارے میں آئمہ اہل بیت علیہم السلام کے اقوال اور اس کے سبب نزول سے پتا چلتا ہے کہ حرابہ مسلمانوں کے جان ومال پر دست درازی کرنا ہے اور اس میں اسلحہ کا استعمال اور اس سے ڈرانا بھی شامل ہے، خواہ یہ دست درازی ڈاکہ زنی کے قبیل سے ہو، اور آبادی کے اندر ہو یا آبادی سے باہر۔ اس بنیاد پر اس آیہ مبارکہ میں وہ اشرار بھی داخل ہیں جو لوگوں کی جانوں، اموال، اور ناموسوں پر حملہ آور ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس آیہ مبارکہ میں جس بات کی طرف متوجہ ہونا چاہیے وہ یہ ہے کہ اس میں انسان کے خلاف کسی بھی قسم کی تعدی کے مقابلے میں جنگ کا اعلان کیا گیا ہے، اور اس تعدی و دست درازی کو اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ قرار دیا گیا ہے، یہ نکتہ اس امر کو واضح اور ثابت کرتا ہے کہ اسلام نے نوع بشر کے حقوق، اور ان کے امن وسلامتی کی بہت زیادہ رعایت اور اہتمام کیا ہے۔

مفسرین وفقہا کے نزدیک عزتوں پر ہاتھ ڈالنا حرابہ کی تعریف میں آتا ہے جس کی سزا قرآن کی اسی آیت میں موجود ہے۔ گویا اسلام میں زبردستی، اور جنسی تشدد کی قطعا کوئی اجازت نہیں اور اس پر حد ہے۔ کیونکہ اسلام کسی بھی حالت میں زنا کرنے کی اجازت نہیں دیتا، بلکہ مرد وعورت کو یہ اجازت دیتا ہے کہ اگر اس کی ناموس پر کوئی حملہ آور ہو اور جان لینے کے سوا عزت بچانے کی کوئی صورت موجود نہ ہو تو وہ حملہ آور کی جان بھی لے سکتے ہیں، اور اگر اس صورت میں ان میں سے کسی کی جان چلی جائے تو وہ شہادت کے رتبے پر فائز ہو گا۔ غیر مسلم عورت شہیدہ تو نہیں کہلائے گی، لیکن جان بچانے کا حق اسے بھی حاصل ہے۔ کوئی مسلمان کسی غیر مسلم عورت کی ناموس پر حملہ آور نہیں ہو سکتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک شخص نے بنو ہذیل کے ایک فرد کو مہمان ٹھہرایا، اس کی ایک لونڈی کمرہ گرم کرنے کے لیے آگ لے کر گئی تو اس شخص نے لونڈی کو اپنے تصرف میں لانا چاہا، لونڈی نے اسے ایک پتھر دے مارا

جس سے وہ مر گیا۔ مقدمہ حضرت عمرؓ کے پاس آیا تو آپ نے فرمایا: اسے اللہ نے قتل کیا، اس کی نجات کبھی نہیں ہو گی۔[۱]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: من قتل دون ماله فهو شهيد، ومن قتل دون أهله فهو شهيد، ومن قتل دون دينه فهو شهيد، ومن قتل دون دمه فهو شهيد.[۲] (جو اپنا مال بچاتے ہوئے مارا گیا وہ شہید ہے، جو اپنے اہل وعیال کو بچاتا ہوا مارا گیا وہ بھی شہید ہے، جو اپنے دین کی خاطر مارا گیا وہ بھی شہید ہے، اور جو اپنی جان بچاتے ہوئے مارا گیا وہ بھی شہید ہے)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو اپنی اہلیہ کو قابل اعتراض حالت میں دیکھے اور پھر چپ رہے اور اس صورت حال کو دفع نہ کرے (دیوث) تو اللہ تعالی اسے جنت میں داخل کرے گا اور نہ ہی اس کی طرف نظر التفات فرمائے گا۔[۳]

غیر مسلم علاقوں پر جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی مسلمان کو عامل بنا کر روانہ فرماتے تو اسے کچھ ہدایات دیتے تھے، اس کا سب سے بہتر نمونہ آپ ﷺ کی وہ نصیحت ہے جو آپ نے جناب عمرو بن حزم کو یمن پر مقرر کرتے ہوئے فرمائی ہے۔ اس کا ابتدائی حصہ یہ ہے: يا أيها الذين آمنوا أوفوا بالعقود، عهد من محمد النبي رسول الله لعمرو بن حزم، حين بعثه إلى اليمن، أمره بتقوى الله في أمره كله، فإن الله مع الذين اتقوا والذين هم محسنون، وأمره أن يأخذ بالحق كما أمره الله، وأن يبشر الناس بالخير، ويأمرهم به، ويعلم الناس القرآن ويفقههم فيه، وينهى الناس، فلا يمس القرآن إنسان إلا وهو طاهر، ويخبر الناس بالذي لهم، والذي عليهم، ـحتى قال في آخره۔ وإنه من أسلم من يهودي أو نصراني إسلاما خالصا من نفسه، ودان بدين الاسلام، فإنه من

۱۔ عبد الرزاق، المصنف۹: ۴۳۵؛ ابن ابی شیبہ، المصنف۹: ۳۷۲

۲۔ نسائی، السنن۷: ۱۱۶؛ صححہ الشیخ الألبانی فی صحیح سنن نسائی۳: ۸۵۸

۳۔ احمد بن حنبل۹: ۳۴، ۳۵؛ صححہ الأستاذ أحمد شاکر علی ھامشہ

المؤمنين، له مثل مالهم، وعليه مثل ما عليهم، ومن كان على نصرانيته أو يهوديته فإنه لا يرد عنها، وعلى كل حالم: ذكر أو أنثى، حر أو عبد، دينار واف أو عوضه ثيابا، فمن أدى ذلك فإن له ذمة الله وذمة رسوله[1] (اے وہ لوگو جو ایمان لے آئے ہو، اپنے کیے ہوئے معاہدے پورے کرو، یہ عہد (مکتوب) اللہ کے رسول اور نبی محمد کی جانب سے عمرو بن حزم کے لیے ہے، جب انہوں نے اسے یمن کے لیے بھیجا، اور اسے حکم دیا کہ وہ اپنے تمام امور میں اللہ کا تقوی اختیار کریں، کیونکہ اللہ تقوی شعاروں اور احسان کرنے والوں کے ساتھ ہے، اور انھیں حکم دیا کہ ہمیشہ حق کے ساتھ رہیں جیسا کہ اللہ تعالی نے حکم دیا ہے۔ نیز یہ کہ لوگوں کو خیر کی بشارت دیں، نیز ان لوگوں کو بھی خیر کرنے کا حکم دیں۔ نیز یہ کہ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیں اور ان میں قرآن کی سمجھ پیدا کریں، مزید یہ کہ لوگوں کو قرآن مجید چھونے سے منع کریں جب تک کہ وہ پاک و طاہر نہیں ہوں۔ اور یہ کہ لوگوں کو بتائیں کہ ان کے حقوق کیا ہیں اور ان پر کیا فرائض ہیں۔۔۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ آخر میں فرماتے ہیں: یہودی اور نصرانی میں سے اگر کوئی خوش دلی سے اسلام قبول کرلے، اور اس پر عمل پیرا ہو جائے تو وہ صاحبان ایمان میں سے ہے، اس کے وہی حقوق و فرائض ہیں جو دوسرے مسلمانوں کے ہیں، مزید یہ کہ جو لوگ اپنی نصرانیت یا یہودیت پر باقی رہیں، تو انھیں ان کے مذاہب سے ہٹایا نہیں جائے گا، اور ہر بالغ خواہ مرد یا عورت آزاد ہو یا غلام سے ایک دینار یا اس کے عوض کپڑے لیے جائیں گے، جو یہ تاوان ادا کرے گا اس کا ذمہ اللہ اور اس کے رسول پر ہے)۔

اس نامہ مبارک کو پڑھیں تو اس میں سوائے تقوی شعاری اور لوگوں کے ساتھ خیر کا معاملہ کرنے کے، قرآن مجید کی پاکیزہ تعلیمات سے نفع اندوز ہونے کے اور کچھ نہیں ملے گا۔ اس پر مستزاد یہ کہ یہودیوں اور مسیحیوں کو انہیں حقوق کا حامل قرار دیا گیا ہے جو حقوق خود مسلمانوں

۱۔ ابن ہشام، السیرۃ ۲: ۵۹۴، ۵۹۶

کے ہیں جن میں سے ایک عورتوں اور مردوں کی عزتوں کی حفاظت کرنا اور ناجائز مطلب براری سے بچنا ہے، کیونکہ اس بارے میں اللہ اور اس کے رسول نے ذمہ لیا ہوا ہے۔

اسی لیے دار الحرب، یعنی وہ علاقے جو مسلمانوں سے حالت جنگ میں ہوں، اگر مسلمان ان میں داخل ہوں تو وہاں بہت سی جانوں اور اشیا کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب جناب یزید بن ابو سفیان (رض) کو شام روانہ فرمایا تو دو میل تک ان کے ساتھ گئے اور لشکر کو یہ وعظ کیا: إني سمعت رسول الله ﷺ يقول: من اغبرت قدماه في سبيل الله حرمهما الله عن النار۔۔۔ ثم قال: أوصيكم بتقوى الله، لا تعصوا، ولا تغلوا، ولا تجبنوا، ولا تغرقوا نخلا، ولا تحرقوا زرعا، ولا تحبسوا بهيمة، ولا تقطعوا شجرة مثمرة، ولا تقتلوا شيخا كبيرا، ولا صبيا صغيرا[1] (میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس کے دونوں قدم اللہ کی راہ میں خاک آلودہ ہوئے، اللہ نے ان دونوں پر جہنم کی آگ حرام قرار دی ہے۔۔۔ پھر انھوں نے فرمایا: میں تمھیں تقوے کی وصیت کرتا ہوں، اللہ کی نافرمانی نہ کرو اور (مالِ غنیمت میں) خیانت نہ کرو، بزدلی نہ دکھانا، کھجوروں کے درختوں کو جڑ سے نہ اکھاڑنا، نہ ہی زرعی پیداوار کو جلانا، کسی چوپائے کو باندھ کر نہ رکھنا، نہ کسی پھل دار درخت کو کاٹنا، کسی سن رسیدہ یا کسی چھوٹے بچے کو قتل نہ کرنا)۔ الخ۔

اس وصیت میں اللہ کا تقوی اختیار کرنے اور اس کی معصیت نہ کرنے کا ذکر ہے، جس میں غیر عورتوں سے بدکاری ایک گناہ کبیرہ اور کھلی نافرمانی ہے۔ چنانچہ اسلام نے اس سے بچنے کے لیے دار الحرب میں عورتوں سے ازدواج کرنے کا اختیار دیا ہے، اگر کوئی شخص اپنے نفس پر قابو نہ رکھ سکتا ہو۔ لیکن اہل کتاب خواتین سے ایسی تزویج کو مکروہ قرار دیا ہے، جب کہ انتہائی مشقت کی صورت میں اسے جائز قرار دیا ہے۔[2]

۱۔ المروزی، مسند أبي بكر، ۲۱، أحمد، فضائل الصحابة، ۷۰۰

۲۔ امام محمد بن حسن الشیبانی، کتاب السیر الکبیر، شرحہ الإمام السرخسی ۵: ۱۰۰- ۱۰۱، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۹۹۷ء

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق کسی علاقے کو فتح کرنے کے بعد غنیمت کی تقسیم امام یا اس کے نائب سے متعلق ہوتی ہے، جو مرد یا عورتیں گرفتار کی جائیں گی انھیں خلیفہ وقت یا اس کا نائب غازیوں میں تقسیم کرے گا، اس کے بعد ہی ان سے کسی قسم کے تعلقات قائم کیے جاسکتے ہیں۔ فقہاء نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ گرفتار کرنے والے شخص کو قیدی پر کوئی اختیار حاصل نہیں ان کے بارے میں امام ہی فیصلہ کرے گا۔[1] کثرت سے ایسے واقعات ملتے ہیں کہ اس طرح حاصل شدہ خواتین سے ان کے ایمان لانے کے بعد نکاح کر لیا تھا۔ نکاح کرنے سے قبل بھی ان سے جسمانی تعلقات رکھنے کی اجازت تھی اور ان کے بطون سے بچے پیدا ہوتے تھے لہٰذا ایسی عورتوں کو ام الولد کہا جاتا تھا۔ غرض یہ کہ جنسی زبردستی کی اجازت موجود نہیں تھی۔ قرآن مجید نے مشرکات کے ساتھ نکاح کرنے کا ضابطہ واضح طور پر بیان کر دیا ہے: ﴿وَلا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّى يُؤْمِنَّ وَلأَمَةٌ مُؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِنْ مُشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ وَلا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّى يُؤْمِنُوا وَلَعَبْدٌ مُؤْمِنٌ خَيْرٌ مِنْ مُشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ﴾ [البقرۃ۲: ۲۲۱] (اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں، صاحب ایمان باندی ایک دل لبھانے والی مشرک عورت سے بہتر ہے، اور نہ ہی مشرک مردوں سے نکاح کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں، ایک صاحب ایمان غلام اس مشرک سے بہتر ہے جو تمہارے دل کو بھا جائے)۔

نتیجہ یہ کہ اسلام نے زنا کرنے کو تو ہر ہر پہلو سے منع کیا ہے اور اسے گناہ کبیرہ قرار دیا ہے نیز یہاں تک فرمایا ہے: ﴿وَلا تَقْرَبُوا الزِّنَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلا﴾ [الاسراء۱۷: ۳۲] (زنا کے قریب بھی نہ جانا یہ ایک فحش عمل ہے اور بہت ہی برا راستہ ہے)۔ "قریب بھی نہ جانا"

۱۔ شافعی، الأم ۸: ۴۴۹؛ السرخسی، المبسوط ۱۰: ۲۵؛ شرح السیر الکبیر ۲: ۶۵۱؛ ابن قدامۃ، المغنی ۱۰: ۴۳۰

کے الفاظ نے ان تمام مقدمات پر خط تنسیخ پھیر دیا ہے جن کے بعد انسان، مرد یا عورت، اس عمل شنیع کے ارتکاب پر جرأت کر سکتے ہیں۔

زنا کی ایک اور قبیح صورت لواطت کی ہے یعنی دو مردوں یا دو لڑکوں کا جنسی ملاپ۔ یہ ایسی قبیح شکل ہے قرآن مجید نے جس قوم کی طرف حضرت لوط علیہ السلام کو ہدایت کے لیے بھیجا تھا، جو سدوم اور گمارا کے رہنے والے تھے، وہ اسی فعل حرام میں مبتلا تھے، انھیں سمجھانے کے باوجود باز نہ آئے تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان پر پتھروں اور آگ کا عذاب نازل کیا اور وہ بستیاں تباہ ہو گئیں۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں، کتاب مقدس، پیدائش، ۱۹: ۲۳۔۲۹)

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر قوم سدوم و گمارا اور ان کے انجام بد کا ذکر ان کے اسی جرم کے ساتھ ہوا ہے۔ مثلاً سورۃ اعراف میں ارشاد فرمایا ہے: ﴿وَلُوطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِنَ الْعَالَمِينَ. إِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِنْ دُونِ النِّسَاءِ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُسْرِفُونَ. وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلا أَنْ قَالُوا أَخْرِجُوهُمْ مِنْ قَرْيَتِكُمْ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ. فَأَنْجَيْنَاهُ وَأَهْلَهُ إِلا امْرَأَتَهُ كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِينَ. وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ﴾ [الاعراف ۷: ۸۰- ۸۴] حد سے بڑھ جانے والی قوم ہو۔۔۔ یہاں تک کہ فرمایا۔ ہم نے ان پر بارش برسائی پتھروں کی، پس دیکھو مجرموں کا انجام کیسا ہوتا ہے۔ سورۃ شعراء (۲۶) میں کہا گیا ہے کہ ہم نے انہیں بری طرح تباہ کر دیا، اور ان پر بدترین بارش برسائی جو ان ڈرائے جانے والوں پر بھیجی گئی۔ (آیات، ۱۷۱ و ۱۷۲) اسی لیے جمہور فقہا نے لواطت کو زنا قرار دیا ہے اور اس کی سزا بھی وہی رکھی ہے جو زنا کی ہے۔ اس ضمن میں ایک حدیث بھی نقل ہوئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: إذا أتى الرجل الرجل فهما زانيان (جب دو آدمی ایک دوسرے سے بد فعلی کرتے ہیں تو دونوں زناکار ہیں)۔ گو کہ اس روایت کی استنادی حیثیت ضعیف و منکر کی ہے مگر فقہائے کرام نے اسے بطور ضابطہ قبول کیا ہے اور ابن حجر اپنی کتاب تلخیص الحبیر میں بھی اسے لائے ہیں، اور کہا ہے کہ اس کا ایک راوی

متہم بالکذب ہے۔[۱] خلاصہ یہ کہ غیروں سے جنگ کی صورت میں مسلمان غلبہ پانے کی صورت میں کوئی جنسی زیادتی اور تشدد دوسری قوم پر روا نہیں رکھ سکتے۔

خارجیوں اور باغیوں پر جنسی تعدّی

صدر اسلام میں بھی مسلمانوں کے درمیان لڑائیاں ہوئیں جن میں صدہا مسلمان دونوں اطراف سے قتل کر دیے گئے، انھیں امام وقت کے خلاف اقدام کرنے کی وجہ سے فقہا کبھی خارجی کہتے ہیں اور کبھی باغی۔ قرآن مجید نے ان کے بارے میں مکمل ضابطہ اور قانون بیان فرمایا ہے اور اس آیت میں مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان لڑائی کی صورت میں یہ احکام دیے گئے ہیں: ﴿وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللهِ فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾ [الحجرات۴۹: ۹] (اگر مؤمنوں کے دو گروہ آپس میں لڑ بیٹھیں تو ان دونوں کے درمیان صلح کروا دو، پھر اگر ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے تو اس سے لڑو جس نے زیادتی کی، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پھر جائے۔ اور اگر وہ اس طرف لوٹ آئے تو ان دونوں گروہوں کے درمیان صلح کروا دو انصاف کے ساتھ، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے)۔

یہ آیت مبارکہ (الحجرات، ۴۹: ۹) بھی اپنی دلالت میں بالکل واضح ہے کہ اس کی ابتداء ہی "اگر مؤمنین کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو۔۔۔" سے ہوتی ہے یعنی یہ مؤمنوں کی باہمی لڑائی کے متعلق ہے، اس میں لڑنے والے گروہ کو "باغی" کہا گیا ہے، نہ کہ غیر مسلم یا کافر۔ اس کی مکمل تشریح حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانے میں ہوئی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جو مانعین زکاۃ کے خلاف جو جنگ ہوئی اس میں حضرت ابو بکرؓ نے سردار لشکر کو یہ ہدایات دیں: وأمر ألا يتبع مول، ولا يجهز على جريح، ولم تحل أموالهم، بخلاف الواجب في

۱۔ ابن حجر، تلخیص الحبیر ۴: ۵۵؛ بیہقی ۸: ۲۳۳

الكفار[۱] (جو جنگ سے واپس پلٹ جائے اس کا پیچھا نہیں کیا جائے، نہ زخمی ہونے والے کا مال (زرہ، تلوار، خود وغیرہ) چھینا جائے گا، اور نہ ان کی ملکیت جو چیزیں ہیں وہ دوسروں کے لیے حلال قرار دی جائیں گی، یعنی ان کا معاملہ کفار کے معاملے سے ہٹ کر ہے)۔ قاضی ابو بکر ابن العربی نے اس بات پر زور دیا ہے کہ مسلمان آپس میں لڑیں تو وہ باغی کہلائیں گے، نہ کہ کافر۔ وہ لکھتے ہیں: هذه الآية هي الأصل في قتال المسلمين، والعمدة في حرب المتأولين، وعليها عول الصحابة، وإليها لجأ الأعيان من أهل الملة، وإياها عنى النبي - صلى الله عليه وسلم - بقوله: تقتل عمارا الفئة الباغية[۲] (یہ آیت مبارکہ مسلمانوں کے باہمی قتال کے احکام کے بارے میں اصل کی حیثیت رکھتی ہے، اور تأویل کی راہ سے جنگ کرنے والوں کا اس پر انحصار ہے، اسی طرف صحابہ نے رجوع کیا، اور ملت کے بڑے بڑے علما و فقہا نے اسے اختیار کیا۔ نیز یہی مطلب ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اس فرمان کا: عمارؓ کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا)۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہدِ خلافت میں مسلمانوں کے درمیان تین بڑے معرکے ہوئے ایک تو جنگ جمل، دوسرے جنگ نہروان، اور تیسرے جنگ صفین، اور ان جنگوں میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے مسلمانوں کی باہمی جنگوں کے اصول طے کر دیے۔ چنانچہ خلیفہ راشد ہونے کی وجہ سے ان کا طرز عمل امت کے لیے لائق تقلید قرار دیا گیا۔[۳]

علمائے کرام نے وضاحت کی ہے کہ یوم جمل حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اعلان کروا دیا تھا: لا يذفف (لا يجهز) على جريح، ولا يهتك ستر، ولا يفتح باب، ومن أغلق بابا --أو بابه-- فهو آمن، ولا يتبع مدبر[۴] (زخمی شخص پر حملہ کر کے اس کا مال نہیں لوٹا جائے گا، نہ ہی

۱۔ تفسیر قرطبی ۱۶: ۳۱۷

۲۔ ابن العربی، أحکام القرآن ۴: ۱۷۱۷

۳۔ علامہ یوسف قرضاوی، فقہ الجہاد، الجزء الثانی ۱۱۱۷، مکتبہ وہبہ، قاہرۃ، ط ۳

۴۔ عبد الرزاق، المصنف، کتاب العقول ۱۸۵۹۰؛ سعید بن منصور، السنن، باب جامع الشهادة ۲: ۳۳۷؛ ابن ابی شیبہ، المصنف، کتاب الجمل، ۳۸۹۷۱؛ بیہقی، الکبریٰ، کتاب قتال اہل البغی ۸: ۱۸۱

اس کی پردہ دری کی جائے گی، نہ کسی کا دروازہ زبردستی کھولا جائے گا، جس نے اپنا دروازہ بند کر لیا وہ حالت امان میں ہے، لڑائی سے منہ موڑ کر جانے والے کا پیچھا نہیں کیا جائے گا۔۔۔ اور یہی ضابطہ مسلمانوں کے درمیان آج بھی موجود ہے۔ یہ صرف اعلان ہی نہیں تھا بلکہ اس پر عمل بھی کیا گیا۔ جس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے: عن أبي أمامة، أنه قال: شهدت صفين، فكانوا لا يجيزون على جريح، ولا يقتلون موليا، ولا يسلبون قتيلا[1] (ابو اُمامہؓ کہتے ہیں کہ میں صفین کی جنگ میں موجود تھا، یہ لوگ نہ زخمیوں پر حملہ کرتے تھے، نہ جنگ سے پلٹ جانے والوں کو قتل کرتے تھے اور نہ ہی قتل ہو جانے والے کا اسباب لوٹتے تھے)۔ جنگ صفین شروع ہونے سے قبل امیر المؤمنین نے یہ فرمان جاری کیا: لا تقاتلوهم حتى يبدؤوكم، فإنكم بحمد الله على حجة، و تركككم إياهم حتى يبدؤوكم حجة أخرى لكم عليهم، فإذا كانت الهزيمة بإذن الله فلا تقتلوا مدبرا، ولا تصيبوا معورا، ولا تجهزوا على جريح، ولا تهيجوا النساء بأذى، وإن شتمن أعراضكم وسببن أمرآءكم، فإنهن ضعيفات القوى، والأنفس والعقول، إن كنا لنؤمر بالكف عنهن، وإنهن لمشركات، وإن كان الرجل ليتناول المرأة في الجاهلية بالفهر أو الهراوة فيعير بها وعقبه من بعده[2] (جب تک یہ جنگ کی ابتدا نہ کریں تم ان سے جنگ نہ کرو؛ کیوں کہ الحمدللہ تم حق پر ہو دلیل کے ساتھ، اور تمہارا ان سے جنگ میں ابتدا نہ کرنا ان پر ایک اور حجت بن جائے گا۔ پس اگر یہ اللہ کے حکم سے شکست کھا جائیں تو پیٹھ دکھانے والوں کو قتل نہ کرو، ایسے پر نہ چڑھ دوڑو جو لاچار ہو چکا ہو، قریب مرگ زخمی کو قتل نہ کرو، عورتوں کو تکلیفیں دے کر انہیں ہیجان میں نہ ڈالو، خواہ وہ تمہیں بے نقط ہی کیوں نہ سنائیں اور تمہارے سرداروں کو برا کہیں، کیونکہ ان کی قوتیں، نفس اور عقلیں کمزور ہیں)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانے میں ہمیں حکم دیا جاتا تھا کہ ہم ان سے اپنے ہاتھوں کو روکے

۱۔ ابن ابی شیبہ، کتاب السیر ۳۳۹۵۳؛ حاکم، المستدرک ۲: ۱۵۵؛ بیہقی، الکبری، کتاب قتال اہل البغی ۸: ۱۸۱

۲۔ السید شریف الرضی، نہج البلاغۃ، رقم ۱۴، من کتبہ علیہ السلام

رکھیں حالانکہ وہ مشرک عورتیں تھیں، عہد جاہلیت میں اگر کوئی مرد کسی عورت کو پتھر مار کر، یا اپنی چھڑی سے اشارہ کر کے قبضے میں لے لیتا تھا تو اس شخص اور اس کی اولاد دونوں کے لیے باعث عار تھا۔

یہاں تک کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے خوارج کو بھی غیر مسلم نہیں بلکہ مسلمان تصور کیا اور ان سے نہروان کے مقام پر جنگ کی تو فرمایا کہ ان کے زخمیوں کو قتل نہیں کیا جائے، زخمی کا مال و اسباب نہ لوٹا جائے، جو جنگ سے فرار اختیار کرے اس کا پیچھا نہ کیا جائے اور نہ ہی عورتوں اور بچوں پر ہاتھ اٹھایا جائے۔ چنانچہ جب عبد الرحمان بن ملجم کو، جس نے امیر المؤمنین پر تلوار ماری تھی، آپ کے سامنے لایا گیا تو آپ نے اس کے ہاتھ کی رسیاں ڈھیلی کرا دیں اور حکم دیا کہ اگر میں زندہ رہ گیا تو اس کا فیصلہ خود کروں گا، لیکن دنیا سے چلا گیا تو اسے بھی صرف ایک ہی ضرب لگانا۔ جس عورت نے ابن ملجم کو شادی کی پیش کش کی تھی اس کا نام قطامہ تھا۔ اس نے امیر المؤمنین کی شہادت کے تمام اسباب مہیا کیے تھے، لیکن اس عورت کو حضرت کی شہادت کے بعد کچھ نہیں کہا گیا۔ یہی احکام مسلمانوں کے تمام طبقات سے لڑائی کی صورت میں عائد ہوتے ہیں۔

اہل عرب اور دنیا کی دیگر تہذیبوں میں مفتوحہ اقوام کی عورتوں کے ساتھ بے محابہ ملاپ معمول کی بات سمجھی جاتی تھی اور اس پر کسی قسم کی قدغن نہیں تھی۔ یہ امر پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے، جب کہ اسلام نے پابندی لگا دی کہ غنیمت تقسیم ہونے سے قبل ایسا کوئی جسمانی تعلق قائم نہیں کیا جا سکتا۔ بعد ازاں اسلام نے تدریجاً ایسی اصلاحات کیں کہ غلامی کا یہ ادارہ ختم ہی ہو گیا۔

موجودہ بین الاقوامی قوانین، اقوام متحدہ کے چارٹر، اور بین الاقوامی معاہدوں کے تحت جنگی قیدیوں اور گرفتار شدہ مسلح دہشت گرد افراد کے درمیان فرق رکھا گیا۔ مؤخر الذکر لوگوں کو "جنگی قیدی" نہیں مانا جاتا ہے۔ ہر دو صورتوں میں عورتوں اور لڑکیوں سے جبری طور پر جسمانی تعلقات قائم نہیں کیے جا سکتے۔

اس مقام پر ایک لطیف نکتے کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں، جس میں بہت سے مسائل حل کرنے میں غالبا مدد مل سکتی ہے۔ وہ یہ کہ اسلام نے بہت سے امور کی اجازت دی ہے لیکن انہیں وجوب کے حکم میں نہیں لیا جاسکتا، مثلا جنگ میں قید ہونے والی عورتوں کو اپنی باندیاں، اور لونڈیاں قرار دینا، نیز مردوں کو گویا زر خرید غلام بنالینا وغیرہ۔ جبکہ اسلام تکریم انسانیت کا قائل ہے اور ان طبقات کے ساتھ انتہائی محبت ورأفت کا سلوک روا رکھنے کی تعلیم دیتا ہے تو کیوں نہ بین الاقوامی دستاویزات کی اس سلسلے میں پاس داری کی جائے! مثال کے طور پر جنگی قیدیوں اور باغیوں کو غلام یا لونڈیاں بنانے کا مسئلہ ہے، عہد رسالت اور عہد خلفائے راشدین میں لونڈیاں اور غلام بنائے جانے کا ذکر جابجا ہے، لیکن "حکم" کہیں نہیں ہے کہ ایسا کیا جائے۔ یہ اس زمانے کا رواج تھا جسے جاری رکھا گیا، اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے غزوے کے لیے آمادہ کرتے ہوئے کبھی نہیں فرمایا کہ تم ان کی عورتوں کو بھی حاصل کروگے، گویا ان غزوات میں جنسی کشش یا جنسی تشدد کا کوئی عنصر روا نہیں رکھا گیا۔

جنگی قیدیوں کو غلام بنانے سے متعلق اسلامی نقطۂ نظر: ایک تحقیقی جائزہ

ڈاکٹر محمد عادل*

اللہ تعالیٰ نے انسان کو مدنی الطبع بنایا ہے، اس لیے انسان مل جُل کر رہنا پسند کرتے ہیں، لیکن انسانی طبیعتوں میں چونکہ اللہ تعالیٰ نے تفاوت رکھا ہے، اس لیے ابتدا ہی سے انسانوں کے مابین جنگ وجدل اور لڑائیاں شروع ہوئیں، جو آج کے ترقی یافتہ دور تک جاری ہیں۔ ابتدائی ادوار میں جب انسان نے ترقی کے وہ منازل طے نہیں کی تھیں، جو آج کا انسان طے کر چکا ہے، تو جنگوں میں نقصانات بھی کم ہوتے تھے، لیکن جیسے جیسے انسان ترقی کرتا گیا، انسانی زندگی کو آسان بنانے والی ایجادات کے ساتھ ساتھ جنگوں کے نت نئے اوزار وہتھیار اور طریقے بھی وجود میں آتے رہے، جن سے جنگی تباہ کاریاں بھی بڑھتی رہیں، چاہے زمانۂ قدیم میں پتھروں اور ڈنڈوں سے لڑی جانے والی جنگیں ہوں یا جدید دور کی ایٹمی ہتھیاروں اور جنگی جہازوں کو استعمال میں لا کر لڑی جانے والی جنگیں، جنگ کے متاثرین میں ہمیشہ کمزور طبقات کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ اگرچہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسانیت کا درد رکھنے والوں نے معاشرے کے کمزور طبقات کو جنگ کی تباہ کاریوں سے بچانے کے لیے کوششیں کیں اور بالآخر بیسویں صدی میں قوانینِ جنگ کا ایسا مجموعہ پیش کرنے میں کامیاب ہوئے، جس کو دنیا کے تمام ممالک نے بلا تفریق مذہب، ذات اور رنگ کے تسلیم کیا، اس مجموعہ کو بین الاقوامی قانونِ انسانیت (International Humanitarian Law) کہا جاتا ہے۔ اگرچہ بین الاقوامی قانونِ انسانیت (IHL) کے وجود میں آنے کے بعد جنگی حالات میں عام شہریوں، ان کی تنصیبات پر حملہ نہ کرنے اور جنگی قیدیوں سے انسانی سلوک کے حوالے سے کافی بہتری آئی ہے، لیکن بعض غیر انسانی امور ایسے ہیں جو زمانہ قدیم سے لے کر آج تک جنگوں میں تسلسل کے ساتھ پیش آتے رہے ہیں۔ ان امور میں سے ایک مسلح تصادم کے

* لیکچرار اسلامیات، باچاخان یونیورسٹی چارسدہ

وقت غالب قوت کی طرف سے مغلوب لوگوں کو جنسی تشدد کا نشانہ بنانا ہے، جس کا شکار عام طور پر بچے اور خصوصاً خواتین بنتی ہیں۔ موجودہ دور میں جنگوں میں جنسی تشدد کے واقعات میں اضافہ دیکھنے میں آیا ہے، جس نے انسانیت کا درد رکھنے والوں کو سوچنے پر مجبور کیا ہے، لہٰذا وہ اس مسئلے کے حل کے لیے فکر مند ہیں۔

بعض لوگوں نے جنگوں میں جنسی تشدد کے مسئلے کو اسلام کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کرتے ہوئے یہ رائے اختیار کی ہے کہ اسلام نے جنگوں میں جنسی تشدد کو باندیاں بنانے کی صورت میں قانونی تحفظ فراہم کیا ہے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ یہ الزام محض کم علمی پر مبنی ہے، لیکن میڈیا کے اس دور میں کسی بات کی حقیقت معلوم ہونے تک ایک بڑا طبقہ غیر محقق بات سے متاثر ہو چکا ہوتا ہے، لہٰذا اس بات کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ اس مسئلہ کا تاریخی پس منظر کے ساتھ تحقیقی جائزہ لیا جائے، تاکہ کم علمی پر مبنی اس الزام کی حقیقت معلوم ہو جائے اور الزامات لگانے اور اس کا جواب دینے میں صرف ہونے والی توانائیاں حقیقی مسائل، جیسے جنگوں میں بڑھتے جنسی تشدد کی روک تھام کے لیے بروئے کار لائی جائیں۔ اسی ضرورت کو مد نظر رکھ کر زیرِ نظر مقالے میں غلامی کا تاریخی پس منظر اور اس سلسلے میں اسلامی نقطۂ نظر بیان کیا گیا ہے۔

اس مقالے میں کوشش کی گئی ہے کہ غلامی کے مسئلے سے متعلق جو اشکالات مضامین ومقالات، تقاریر وتحاریر اور میڈیا پر دہرائے جاتے ہیں، ان کی حقیقت معلوم کی جائے، اور ان اشکالات کو مندرجہ ذیل سوالات کی شکل میں ذکر کرکے ان کے جوابات دینے کی کوشش کی گئی ہے:

- کیا غلامی کا تصور اسلام نے پیش کیا؟
- اسلام اور دیگر اقوام کے غلامی کے تصور میں کیا فرق ہے؟
- غلامی کے باب میں اسلام نے کون سی اصلاحات کیں، جو بتدریج اس کے خاتمے کا سبب بنیں؟
- اسلام نے غلامی کو دیگر برائیوں کی طرح یکسر ختم کیوں نہیں کیا؟

- کیا موجودہ دور میں مسلمانوں کے لیے کسی کو غلام بنانا شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟

ابتدا میں غلامی کی لغوی واصلاحی تعریف ذکر کرنے کے بعد مندرجہ بالا سوالات کے جوابات دیے گئے ہیں۔

غلامی کی لغوی واصطلاحی تعریف

عربی میں غلامی کو رِقّ کہا جاتا ہے، جس کے لغوی معنٰی ضعف یعنی کمزوری ہیں، جبکہ علامہ جرجانیؒ نے غلامی کی اصطلاحی تعریف کچھ یوں کی ہے: عبارة عن عجز حكمي شرع في الأصل جزاءً عن الكفر[1] (غلامی حکمی طور پر مجبور ہونے کا نام ہے، جس کو کفر کی جزاء کے طور پر مشروع کیا گیا ہے)۔

غلامی سے متعلق کیا گیا معاہدہ Slavery Convention 1926 میں غلامی اور غلام کی تعریف ان الفاظ کے ساتھ کی گئی ہے:

The status or condition of a person over whom any or all of the powers attaching to the right of ownership are exercised, and 'slave' means a person in such condition or status[2].

ایک انسان کے جزوی یا تمام حقوقِ ملکیت کسی دوسرے کے پاس ہوں، تو اسے غلامی کہتے ہیں اور اس حالت یا حیثیت میں موجود شخص کو غلام کہتے ہیں۔

کیا غلامی کا تصور اسلام نے پیش کیا؟

غلامی کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی انسانی تہذیب، ابتدا میں جب انسان تہذیب وتمدن سے بے خبر تھا اور انسانی طبائع پر بہیمیت غالب تھی تو قبائل کے درمیان مسلح تصادم کے بعد فاتحین مفتوح قبیلہ کے جنگی قیدیوں کو موت کے گھاٹ اتارا کرتے تھے۔ یہ اپنے انتقامی جذبات کا

۱۔ الشریف الجرجانی، علی بن محمد، التعریفات، (دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۹۸۳ء) ص: ۱۱۱

2. Slavery Convention 1926 ,Article:1

اظہار اور غیظ و غضب کو ٹھنڈا کرنے کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا، لیکن جب انسانوں کو اپنی ضروریات پوری کرنے اور اپنے امور خصوصاً کھیتی باڑی میں ہاتھ بٹانے کے لیے بغیر معاوضہ کے افراد کی ضرورت پڑی، تو انتقامی جذبات کی جگہ معاشی ضروریات نے لے لی اور انہوں نے جنگی قیدیوں کو غلام بنانا شروع کیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جنگی قیدیوں کے علاوہ غلامی کے دیگر ذرائع و اسباب بھی تلاش کر لیے گئے اور یہ سلسلہ وسیع ہوتا گیا۔[۲]

جنگی قیدیوں کی حد تک بات کی جائے تو خود ان کے لیے بھی قتل ہونے کی بجائے غلام بن کر زندہ رہنا بہتر تھا اور فاتح و مفتوح دونوں کو اس کا فائدہ ہو رہا تھا، بلکہ لارڈ ایکٹن نے ایسی صورتحال میں غلامی کو آزادی کی منزل کا ایک مرحلہ قرار دیا۔ لیکن بعد میں جب غلام بنانے کے لیے دوسرے اسباب و ذرائع تلاش کر لیے گئے اور غلاموں کی زندگی بد سے بدتر ہونے لگی تو غلامی موت سے بدتر اور زندہ درگور کرنے کے مترادف محسوس ہونے لگی۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ غلامی زمانۂ قدیم سے تمام مذاہب اور تہذیبوں کا حصہ رہی ہے۔ مشرق و مغرب میں ماضی قریب تک غلامی کا رواج رہا، یہاں تک کہ امریکہ میں ابراہام لنکن نے ۱۸۶۳ء میں باضابطہ طور پر غلامی کو ممنوع قرار دیا۔ مذکورہ بالا بحث سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ نہ تو غلامی کا تصور اسلام نے پیش کیا اور نہ ہی اس کی ابتدا اسلام نے کی ہے، بلکہ مسلمانوں کو غلامی ایک نہایت ہی بدترین شکل میں ورثہ میں ملی تھی۔

اسلام اور دیگر اقوام کے تصورِ غلامی میں کیا فرق ہے؟

غلامی کا سلسلہ مختلف ادوار و مذاہب اور تہذیبوں سے گزر کر اسلام تک پہنچا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ مختلف تہذیبوں میں غلامی کے تصور اور غلاموں کے ساتھ ان کے سلوک کا جائزہ لیا جائے، تاکہ اسلام کے تصور غلامی کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

---

1. Durant, Will Durant, The Story of Civilization (Simon & Schuster, New York, 1954) 1 :20

۲۔ نظام الرق عبر العصور، (مركز زايد للتنسيق والمتابعة، دولة الامارات، العربية المتحدة، ۲۰۰۱ء) ص ۱۳

یونانی تہذیب میں غلامی کا تصور

یونانی تہذیب میں غلامی ایک معاشی ضرورت کے طور پر رائج تھی۔ مشہور یونانی فلسفی ارسطو غلامی کو نہ صرف جائز بلکہ مفید خیال کرتا تھا۔ اس کے نزدیک انسانوں کی دو قسمیں ہیں: آزاد اور غلام، آزاد غلاموں پر حکومت کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ اس کے نزدیک غلام محض ایک آلہ کی حیثیت رکھتا تھا[1]۔ یونانی تہذیب میں مندرجہ ذیل اقسام کے لوگ غلام بنائے جاتے تھے:

۱. جنگی قیدی
۲. قزاقوں کے اغوا کیے گئے آزاد افراد
۳. قرض کی ادائیگی سے قاصر ہونے والے افراد
۴. کوئی جرم کرنے والے
۵. لاوارث بچے

یونانی تہذیب میں دیگر اشیا کی طرح غلاموں کی خرید و فروخت کی جاتی تھی اور غلاموں کو ایک تجارتی مال سمجھا جاتا ہے[2]۔ اسی طرح غلاموں کو مختلف قسم کی سزائیں بھی دی جاتی تھیں، جیسے کوڑے مارنا، قید کرنا، پاؤں میں بیڑیاں ڈالنا، گرم لوہے وغیرہ سے داغنا اور سخت مشقت لینا۔ البتہ غلاموں کو آزاد کرنے کا تصور بھی موجود تھا، جس کی تین صورتیں تھیں: پہلی یہ کہ حکومت فوجی خدمات کے لیے غلام کو آقا سے چھڑا کر اپنی تحویل میں لے لیتی، دوسری یہ کہ آقا برضا و رغبت خود ہی غلام کو آزاد کر لیتا اور تیسری یہ کہ غلام کو کسی دیوتا کے لیے وقف کر دیا جاتا۔ لیکن آزاد کردہ غلاموں کو آزادی کے بعد بھی مطلق شہریوں کے حقوق حاصل نہیں ہوتے، بلکہ ان پر کسی شخص کی سرپرستی حاصل کرنا لازم تھا اور آزادی کے بعد بھی بہت سے قواعد و ضوابط کی پابندی اس کے لیے ضروری تھی، اگر آزاد کردہ شخص ان قواعد کی خلاف ورزی کرتا تو دوبارہ غلام بنا لیا جاتا تھا[3]۔

1. Aristotle, Politics , (Batoche Books, Kitchener, 1999), P:7-9
2. The Story of Civilization , 2: 279

۳۔ سعید احمد، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، اسلام میں غلامی کی حقیقت، (مکتبہ جمال، لاہور، ۲۰۱۱ء) ص: ۳۵

رومی سلطنت میں غلامی کا تصور

کئی صدیوں کی طویل مدت پر محیط رومی سلطنت کو ایک متمدن و مہذب معاشرہ سمجھا جاتا ہے، لیکن اس میں بھی غلامی کا تصور نہ صرف موجود تھا، بلکہ رومی سلطنت میں اس کثرت سے غلام پائے جاتے تھے کہ سلطنت کی چوتھائی آبادی غلاموں پر مشتمل تھی۔ یہ غلام ہر طرح بنیادی حقوق سے محروم تھے، ان کو ملکیت، وراثت اور قانونی شادی کے حقوق حاصل نہ تھے، ان کی بیویوں کو لونڈیاں اور اولاد کو غلام تصور کیا جاتا تھا۔ اسی طرح لونڈی کا شوہر چاہے آزاد ہو، لیکن اس کے بچے غلام ہوتے تھے[1]۔ غلام کو معمولی کوتاہی پر ظالمانہ سزائیں دی جاتی تھیں، جیسے قید کرنا، کوڑے مارنا، آگ سے داغنا، یہاں تک کہ آقا کو غلام کے قتل کرنے تک اجازت حاصل تھی[2]۔ غلام کو عام تجارتی سامان کی طرح سمجھا جاتا اور اسی حیثیت سے ان کی خرید و فروخت کی جاتی تھی[3]۔

رومی سلطنت میں مندرجہ ذیل اقسام کے لوگ غلام بنائے جاتے تھے:

۱. جنگی قیدیوں کو غلام بنایا جاتا تھا۔
۲. باندیوں کے بطن سے پیدا ہونے والے بچے بھی غلام تصور کیے جاتے تھے۔
۳. غلام کے بچے بھی غلام تصور کیے جاتے تھے۔
۴. آزاد بچوں کو اغوا کر کے غلام بنا کر بیچ دیا جاتا تھا۔
۵. رومی قانون کی بعض دفعات کے تحت آزاد افراد کی آزادی سلب کر کے غلام بنایا جاتا۔[4]

---

1. The Story of Civilization ,3: 396
2. Milman, Henry Hart ,History of Latin Christianity, (A.C Armstrong, New York ,1903), P:491-495
3. Buckland ,The Roman Law of Slavery, (The University Press,Cambridge,1908), P:39

۴۔ نظام الرق عبر العصور، ص ۲۰

رومی سلطنت کے آخری دور میں غلاموں کی حالت کافی بدل گئی تھی اور ان کو مختلف حقوق دینے کے لیے قانون سازی بھی کی گئی تھی، اس دور میں غلاموں کی آزادی کا تصور موجود تھا، لیکن آزادی کے بعد بھی آزاد کردہ غلام اپنے سابقہ آقا کے خاندان کا نیم غلام سمجھا جاتا تھا۔ غلام کو آزادی کے بعد بھی عام شہری حقوق حاصل نہ تھے، وہ نہ حکمران جماعت کا ممبر بن سکتا تھا، نہ کوئی عہدہ حاصل کر سکتا تھا، حقیقت یہی ہے کہ رومی سلطنت میں آقا غلام کو معاشی مقاصد کے لیے آزاد کرتا تھا، کیونکہ قانون کے مطابق عہدیدار خود اور ان کے بچے تجارت نہیں کر سکتے تھے، لہٰذا وہ غلام سے تجارتی معاہدہ کر کے اس کو آزاد کر دیتے تھے۔[1]

یہودیت میں غلامی کا تصور

یہودیت میں غلامی کا تصور یونانیوں کے تصور سے ملتا جُلتا ہے کہ جس طرح ان کے ہاں یونان کے اصل باشندے حکومت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، بالکل اسی طرح یہود کے ہاں بھی ہے کہ بنی اسرائیل کبھی غلام نہیں بن سکتے[2]۔ ان کی اس سوچ کے پیچھے ان کا یہ عقیدہ کارفرما تھا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ بندے ہیں[3]۔

البتہ یونانیوں اور رومیوں کے مقابلہ میں یہودیت میں غلام کو حقوق دیے گئے تھے، جیسے غلام کو ہفتہ کے دن کام سے لازمی چھٹی دینا[4]، غلام کو جان سے مارنے والے آقا کو سزا دینا[5]، غلاموں کو تہوار کے موقع پر کھانے اور خوشی میں شریک کرنا[6] اور غلام کو میراث کا حق دینا[7] وغیرہ۔

۱۔ اسلام میں غلامی کی حقیقت، ص ۳۹

۲۔ الترمانینی، عبدالسلام، الرق ماضیہ وحاضرہ (عالم المعرفۃ، الکویت، ۱۹۷۸ء)، ص: ۲۸

۳۔ سورۃ المائدۃ ۵ : ۱۸

۴۔ عہد نامہ قدیم، استثنیٰ ۵: ۱۴

۵۔ ایضاً، خروج ۲۱ : ۲۱

۶۔ ایضاً، استثنیٰ ۱۲: ۱۸

۷۔ ایضاً، پیدائش، ۱۵ : ۳ و امثال، ۱۷ : ۲

یہودیت میں کئی طرح کے لوگوں کو غلام بنایا جاسکتا تھا:

۱. جنگ میں گرفتار کیے گئے قیدی کو غلام بنایا جاسکتا تھا[۱]۔

۲. قرض کی ادائیگی سے قاصر شخص کو قرض دہندہ غلام بنالیتا تھا[۲]۔

۳. وہ غلام جس کی شادی آقا کرے، تو آزادی کے بعد اس کی بیوی بچے آقا کے غلام رہیں گے۔

۴. باپ اپنے بچوں کو غلام بنا کر کسی کے ہاتھ بیچ سکتا تھا[۳]۔

۵. مجرم کو جرم کی سزا میں غلام بنایا جاسکتا تھا، جیسے چور کو چوری کا مال واپس نہ کرنے کے جرم میں[۴]۔

یہودیت میں غلام کی آزادی کی مختلف صورتیں موجود تھیں، جن میں گزشتہ تہذیبوں سے ممتاز کرنے والا طریقہ یہ تھا کہ اگر کوئی آقا غلام سے بُرا سلوک کرتا، جیسے تشدد سے اپنے غلام یا باندی کی آنکھ پھوڑ دیتا یا دانت توڑ دیتا، تو بدلے میں اس غلام یا باندی کو آزاد کرنا پڑتا[۵]۔ اسی طرح بنی اسرائیلی (عبرانی) غلام کی غلامی کی مدت سات (۷) سال مقرر کی گئی کہ جو شخص کوئی عبرانی غلام خریدے، تو وہ چھ برس اس کی خدمت کرے گا، لیکن ساتویں برس وہ قیمت ادا کیے بغیر آزاد ہو کے چلا جائے گا[۶]، جبکہ پچاسویں برس، جسے جوبلی کا سال کہا جاتا ہے، جتنے بھی غلام ہیں ان کو آزاد کیا جائے گا[۷]۔ ایک اور عجیب قانون یہ تھا کہ آقا اپنے غلام کی شادی کراتا اور پھر اسے کسی ایسے کام کا حکم دیتا، جو عام طور پر آزاد لوگ کرتے ہیں، تو غلام آزاد ہو جاتا۔

۱۔ ایضاً، استثنا، ۲۰ : ۱۴

۲۔ ایضاً، سلاطین (۲)، ۴: ۱ و امثال، ۷ : ۲۲

۳۔ ایضاً، خروج ۲۱: ۴- ۷

۴۔ ایضاً، ۲۲: ۳

۵۔ عہد نامہ قدیم، خروج ۲۱: ۲۶، ۲۷

۶۔ ایضاً، استثنا ۱۵: ۱- ۴ و خروج، ۲۱: ۲

۷۔ ایضاً، احبار، ۲۵: ۱۰

قدیم تہذیبوں کے مقابلے میں اگرچہ یہودیت میں غلاموں کے حوالے سے کافی نرمی موجود تھی، لیکن غلام معاشرتی لحاظ سے بہت ذلیل وپست سمجھے جاتے تھے اور انہیں کسی شریف عورت سے نکاح کرنے یا کسی مجمع کے سامنے مذہبی کتاب کی آیات پڑھنے کے قابل نہیں سمجھا جاتا تھا[۱]۔

مسیحیت میں غلامی کا تصور

مسیحیت کی مذہبی کتب میں غلامی کے تذکرے اور اس کے متعلق بعض احکامات شامل ہیں، لیکن یہودیت کی طرح یہاں غلاموں سے متعلق کوئی واضح ہدایات موجود نہیں[۲]۔ عہد نامہ جدید میں کئی مقامات پر غلاموں کو اس بات کا پابند بنایا گیا ہے کہ آقا کی خدمت بھرپور طریقہ سے بجالائے، چاہے آقا نیک دل وحلیم ہو یا بدمزاج وظالم[۳]۔ اسی طرح ایک جگہ قرض کی ادائیگی میں ناکامی پر قرض دہندہ کو اس بات کی اجازت دی گئی کہ مقروض کے تمام خاندان کو بیچ کر اپنا قرض وصول کرے[۴]۔ غلام کی آزدی سے متعلق بھی یہ بات کہی گئی ہے کہ جو شخص مسیحیت میں داخل ہو جائے، وہ دیگر تمام لوگوں کی غلامی سے نکل آتا ہے اور مسیح کی غلامی میں داخل ہو جاتا ہے[۵]۔

اگرچہ مسیحیت کی مذہبی کتب میں غلامی سے متعلق کوئی زیادہ تفصیل موجود نہیں اور صرف غلام کو آقا کی اطاعت کا ہر حال میں پابند بنایا گیا ہے، جبکہ غلام کے حقوق کے متعلق ہدایات کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا، لیکن دیکھا جائے تو عیسائی معاشروں اور حکومتوں میں غلاموں کا باقاعدہ رواج کوئی پوشیدہ امر نہیں، جیسا کہ اس مضمون میں عیسائیت کے نام پر قائم رومی سلطنت میں غلاموں کی حالت زار بیان کی گئی ہے۔

۱۔ اسلام میں غلامی کی حقیقت، ص: ۳۰

۲۔ عہد نامہ جدید، کرنتھیوں، ۷: ۲۱

۳۔ ایضاً، پطرس (۱)، ۲: ۱۸ و افسیوں، ۶: ۵

۴۔ عہد نامہ جدید، متی کی انجیل ۱۸: ۲۵

۵۔ ایضاً، گلتیوں ۳: ۲۷

زمانۂ جاہلیت میں غلاموں کی حالت زار

اسلام میں غلامی کے تصور پر بحث کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں غلاموں کی حالت زار کیا تھی؛ تاکہ یہ سمجھنے میں آسانی ہو کہ اسلام کو غلامی کس صورت حال میں ملی۔

زمانۂ جاہلیت میں عربوں کے ہاں غلامی کا رواج عام تھا، عکاظ اور ذوالمجاز کے میلوں میں ان غلاموں کی بھیڑ بکریوں کی طرح خرید وفروخت ہوتی تھی[۱]، یہ غلام ہر قسم کے حقوق سے محروم تھے، ان غلاموں پر وحشیانہ تشدد جائز سمجھا جاتا تھا، جیسے ابتدائے اسلام میں سیدنا بلالؓ وغیرہ کے واقعات سیرت کی کتب میں موجود ہیں، بلکہ بعض اوقات آقا ان غلاموں کو قتل کر دیتے تھے اور ان کے ہاں یہ کوئی جرم نہیں سمجھا جاتا تھا، ان غلاموں سے مختلف قسم کی خدمات لی جاتی تھیں اور جنگ میں بھی ان کو لڑوایا جاتا تھا، اسی طرح باندیوں کو مال کمانے کے لیے قحبہ گری پر مجبور کیا جاتا تھا[۲]۔

عرب جنگی قیدیوں کے علاوہ آزاد افراد کے غلام بنانے کو جائز خیال کرتے تھے، جیسے زید بن حارثہؓ[۳] اور سلمان فارسیؓ[۴]، جو آزاد افراد تھے اور اپنے علاقوں سے اغوا کر کے مکہ مکرمہ میں بیچے گئے تھے۔ اسی طرح غلاموں کو خوشی کے مواقع پر، مختلف شرائط پوری کرنے پر آزاد کرنے کے طریقے موجود تھے۔

اسلام میں غلامی کا تصور

اسلام وحدتِ انسانی کی تعلیم دیتا ہے، قرآن کریم واحادیث میں جابجا انسانیت کی برابری کا تصور دیا گیا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ﴾ [الاعراف ۷: ۱۸۹] (اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے، جس نے تم کو ایک جان (آدم) سے پیدا کیا)۔

۱۔ سعید الافغانی، سعید بن محمد، اسواق العرب فی الجاہلیۃ والاسلام، (دمشق، ۱۹۶۰ء)، ص: ۲۷۸

۲۔ ابن کثیر، اسمٰعیل بن عمر، تفسیر القرآن العظیم = تفسیر ابن کثیر (دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۹۹۹ء) ۶: ۵۱

۳۔ ابن عبد البر، یوسف بن عبد اللہ، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، (دار الجیل، بیروت، ۱۹۹۲ء) ۲: ۵۴۲

۴۔ ابن الاثیر، علی بن ابی الکرم، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۹۹۴ء) ۲: ۵۱۰

قرآن کریم پوری انسانیت کو مخاطب کرتا ہے اور کسی آزاد یا غلام کی تفریق نہیں کرتا، سورۃ الحجرات میں یہی بات پوری وضاحت کے ساتھ موجود ہے: ﴿يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا﴾ [الحجرات۴۹: ۱۳] (اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم میں مختلف خاندان اور کنبے بنا دیے ہیں، تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو)۔

حجۃ الوداع کے موقع پر جب اس وقت کے مسلمانوں کا سب سے بڑا اجتماع منعقد ہوا، تو رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر خطبہ دیتے ہوئے گویا مذکورہ بالا آیات کی تفسیر بیان فرمائی: يَا أَيُّهَا النَّاسُ، أَلَا إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ، وَإِنَّ أَبَاكُمْ وَاحِدٌ[۱] (اے لوگو! سن لو، تمہارا رب ایک ہے، تمہارا باپ ایک ہے)۔

اسی طرح ایک اور حدیث میں آیا ہے: النَّاسُ مُستَوُونَ كَأَسْنَانِ الْمُشْطِ[۲] (تمام لوگ کنگھی کے دندانوں کی طرح برابر ہیں)۔

مذکورہ بالا آیات واحادیث میں انسانوں میں تفریق وامتیاز کی نفی کی گئی ہے۔ ارسطو کا پیش کردہ یہ نظریہ قدیم تہذیبوں میں نہ صرف موجود تھا بلکہ ان کا معاشرتی نظام بھی اس کے مطابق کام کر رہا تھا اور آقا و غلام دو الگ قسم کے انسان سمجھے جاتے تھے۔ قرآن کریم نے انسانوں کے مابین تفریق و تقسیم کو فرعون کا طریقہ قرار دے کر، اس کی مذمت کی، سورۃ القصص میں ارشاد ربانی ہے: ﴿إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِنْهُمْ﴾ [القصص۲۸: ۴] (فرعون زمین (مصر) میں بہت خود سر ہو گیا تھا اور اس کے باشندوں کو طبقوں میں بانٹ رکھا تھا اور ان میں سے ایک گروہ (بنی اسرائیل) کو دبا کر رکھا تھا)۔

۱۔ امام احمد بن حنبل، احمد بن محمد، مسند الامام احمد بن حنبل، (مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۲۰۰۱ء) حدیث نمبر: ۲۳۴۸۹

۲۔ ابو بشر الدولابی، محمد بن احمد، الکنیٰ والاسماء (دار ابن حزم، بیروت، ۲۰۰۰ء) ۲: ۵۲۴

لہٰذا اسلام کی اسی سوچ کی کار فرمائی تھی کہ انسان کے لیے آزادی کو اصل قرار دیا گیا۔ حضرت ربعی بن عامرؓ نے کسریٰ کے دربار میں اسلام کا مقصد یہ بیان فرمایا کہ ہم بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکالنے کے لیے بھیجے گئے ہیں[۱]، اسی طرح سیدنا عمر فاروقؓ نے ایک گورنر سے فرمایا کہ تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنانا شروع کر دیا حالانکہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا ہے[۲]۔

غلامی میں مروج ظالمانہ امور کی اصلاح

زمانۂ جاہلیت میں غلاموں کے ساتھ روا رکھے جانے والے غیر انسانی سلوک کا تذکرہ ہو چکا ہے، اس ماحول میں جب رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی تو آپ نے ابتدا ہی سے عرب معاشرے کے ان ظالمانہ امور کی اصلاح کے لیے کوششیں شروع کیں، ذیل میں چند اصلاحات کا ذکر کیا جائے گا:

۱: مؤاخات

اسلام نے عربوں کے ذہن سے غلاموں پر اپنی احساس برتری ختم کرنے کے لیے غلاموں کو برابری کی بنیاد پر اسلامی اخوت میں شامل کیا۔ ہجرت مدینہ کے بعد جب مؤاخات قائم کرنے کا مرحلہ آیا تو آپ ﷺ نے سیدنا حمزہؓ بن عبد المطلب اور آزاد کردہ غلام زید بن حارثہؓ، عبیدۃ بن الحارثؓ اور آزاد کردہ غلام حضرت بلالؓ اور ابو عبیدہ بن الجراحؓ اور آزاد کردہ غلام سالمؓ کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا[۳]، اسی طرح کئی احادیث میں غلاموں کو مسلمانوں کا بھائی قرار دیا گیا۔

۲: حسن سلوک کا معاملہ

اسلام غلاموں کے ساتھ حسن سلوک اور عادلانہ برتاؤ کی تعلیم دیتا ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ

۱۔ الطبری، محمد بن جریر، تاریخ الرسل و الملوک = تاریخ الطبری (دار التراث، بیروت، ۱۹۶۷ء) ۳: ۵۱۸

۲۔ العمری، اکرم بن ضیاء، عصر الخلافۃ الراشدہ، (مکتبۃ العبیکان، مکہ المکرمۃ، ۲۰۰۹ء) ص: ۱۲۷

۳۔ ابن سید الناس، محمد بن محمد، عیون الاثر (دار القلم، بیروت، ۱۹۹۳ء)، ۱: ۲۳۰

ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ﴾ [النساء۴: ۳۶] (اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، قریبی ہمسایہ، اجنبی ہمسایہ، پاس بیٹھنے والے، مسافر اور اپنے غلاموں کے ساتھ بھی [نیکی کرو])۔

رسول اللہ ﷺ غلاموں کی بابت اتنے فکر مند رہتے کہ آپ نے وفات سے قبل آخری الفاظ غلاموں سے حسن سلوک کی تاکید کے ادا فرمائے: كَانَ آخِرُ وَصِيَّةِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِينَ حَضَرَهُ الْمَوْتُ الصَّلَاةَ الصَّلَاةَ مَرَّتَيْنِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ[1] (وفات کے وقت رسول اللہ ﷺ کی آخری وصیت یہ تھی: نماز کی (پابندی کرو) اور غلاموں سے حسن سلوک کرو)۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے غلاموں سے ان کی طاقت سے بڑھ کر مشقت لینے کی ممانعت فرمائی: هُمْ إِخْوَانُكُمْ، جَعَلَهُمُ اللهُ تَحْتَ أَيْدِيكُمْ، فَمَنْ جَعَلَ اللهُ أَخَاهُ تَحْتَ يَدِهِ، فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَأْكُلُ، وَلْيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ، وَلاَ يُكَلِّفُهُ مِنَ العَمَلِ مَا يَغْلِبُهُ، فَإِنْ كَلَّفَهُ مَا يَغْلِبُهُ فَلْيُعِنْهُ عَلَيْهِ[2] (وہ [غلام] تمہارے بھائی ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں تمہارا ماتحت بنایا ہے۔ تمہارے جس بھائی کو اللہ تعالیٰ تمہارے ماتحت بنائے، اس کو چاہیے کہ وہ جو خود کھائے وہی اس کو بھی کھلائے اور جو خود پہنے وہی اس کو بھی پہنائے، نیز اس سے کوئی ایسا کام نہ لے، جو اس کی طاقت سے باہر ہو اور اگر کوئی ایسا کام اس سے لیا جائے، جو اس کی طاقت سے باہر ہو، تو اس کام میں خود بھی اس کی مدد کرے)۔

اسی سے استنباط کرتے ہوئے فقہی کتب میں ایک قاعدہ ذکر کیا گیا ہے کہ انسان چاہے غلام بن جائے ، لیکن انسان ہونے کے ناطے اسے بنیادی حقوق حاصل ہوں گے: لِأَنَّهُ مُبْقًى عَلَى

۱۔ حاکم، المستدرک علی الصحیحین، کتاب المغازی والسرایا، حدیث نمبر: ۴۳۸۸

۲۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ماینہیٰ من السباب واللعن، حدیث نمبر: ۶۰۵۰

أَصْلِ الْآدَمِيَّةِ فِيمَا هُوَ مِنْ خَوَاصِّ الْآدَمِيَّةِ[1] (کیونکہ انسانیت کے خواص کے باب میں وہ اصل آدمیت پر قائم ہے)۔

۳: تشدد کی ممانعت

قدیم تہذیبوں اور عرب معاشرے میں غلاموں کو معمولی غلطی پر تشدد کا نشانہ بنانا معمول کی بات تھی، جس میں کوڑے مارنا، تپتی دھوپ میں لٹانا اور بھوکا پیاسا رکھنے جیسی سزائیں شامل تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی سختی سے ممانعت فرمائی اور فرمایا کہ غلام چاہے دن میں ستر بار غلطی کرے اس کو معاف کرو: اعفُوا عنه في كُلِّ يومٍ سبعينَ مَرة[2] (ہر روز اس سے ستر مرتبہ درگزر کرو)۔

اسی طرح غلام پر تشدد کرنے کا کفارہ اس کی آزادی کو قرار دیا: مَنْ ضَرَبَ غُلَامًا لَهُ حَدًّا لَمْ يَأْتِهِ أَوْ لَطَمَهُ، فَإِنَّ كَفَّارَتَهُ أَنْ يُعْتِقَهُ[3] (جو اپنے غلام کو بے گناہ مارے یا اس کو طمانچہ رسید کرے، تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اس غلام کو آزاد کر دے)۔

۴: غلاموں کی تعلیم وتربیت

قدیم زمانے میں غلاموں پر لکھنے پڑھنے کی پابندی ہوتی تھی[4]۔ لیکن اسلام نے اس کی باقاعدہ ترغیب دی اور اسے اخروی اجر وثواب کا باعث بتایا۔ صحیح بخاری کی حدیث ہے کہ تین اشخاص کے لیے دگنا اجر ہے، جن میں سے ایک کے متعلق فرمایا: وَرَجُلٌ كَانَتْ عِنْدَهُ أَمَةٌ فَأَدَّبَهَا فَأَحْسَنَ تَأْدِيبَهَا، وَعَلَّمَهَا فَأَحْسَنَ تَعْلِيمَهَا[5] (اور وہ شخص جس کی کوئی باندی ہو اور وہ اس کو بہترین ادب

۱۔ الزیلعی، عثمان بن علی، تبیین الحقائق، (المطبعۃ الکبریٰ الامیریۃ، القاہرۃ، ۱۳۱۳ھ) ۲: ۱۶۴

۲۔ سنن ابی داؤد، کتاب النوم، باب فی حق المملوک، حدیث نمبر: ۵۱۶۴

۳۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب صحبۃ المالیک، حدیث نمبر: ۱۶۵۷

۴۔ اسلام میں غلامی کی حقیقت، ص: ۳۹

۵۔ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب تعلیم الرجل وامتہ، حدیث نمبر: ۹۷

سکھائے اور عمدہ تعلیم دے)۔ اسلام کے اس حکم کو مسلمانوں نے اس طرح مانا کہ غلاموں کو تعلیم دینا، معاشرہ میں عام ہو گیا اور انہی غلاموں میں سے کبار ائمہ اور علما سامنے آئے۔

۵: معاشرتی مقام

قدیم تہذیبوں اور عرب معاشرہ میں غلام کو کمتر سمجھا جاتا اور انہیں معاشرتی امور سے دور رکھا جاتا، حتیٰ کہ آزادی کے بعد بھی وہ معاشرے میں ایک آزاد انسان کا مقام حاصل نہ کر پاتا۔ ان سے رشتہ قائم کرنے کو عار سمجھا جاتا۔ اسلام نے غلام کو غلامی اور آزادی کے بعد دونوں اوقات میں بحیثیت انسان ایک مقام و مرتبہ دیا۔ غلاموں کی رعایت اور ان کی عزت نفس کو مجروح ہونے سے بچانے کی آپ ﷺ کی نظر میں حساسیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ نے غلام کو غلام پکارنے سے منع فرمایا: لَا يَقُولَنَّ أَحَدُكُمْ عَبْدِي وَأَمَتِي، وَلَا يَقُولَنَّ الْمَمْلُوكُ رَبِّي وَرَبَّتِي، وَلْيَقُلِ الْمَالِكُ فَتَايَ وَفَتَاتِي، وَلْيَقُلِ الْمَمْلُوكُ سَيِّدِي وَسَيِّدَتِي[۱] (تم میں سے کوئی میرا غلام یا میری باندی نہ کہے اور نہ غلام میرا رب کہے۔ مالک کو میرے بچے، میری بچی کہنا چاہیے اور غلام کو چاہیے کہ میرا سردار یا سردارنی کہے)۔

آزادی کے بعد اسلام نے غلاموں کو وہی معاشرتی مقام دیا، جو دوسرے عام افراد کو حاصل ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے خود اپنی پھوپھی زاد بہن کا اپنے آزاد کردہ غلام سیدنا زید بن حارثہؓ سے نکاح کیا تھا[۲]۔ آپ ﷺ نے آزاد کردہ غلاموں کو لشکروں کی امارت سونپی، جیسے رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید بن حارثہؓ کو لشکر کا امیر بنایا۔ اسی طرح غزوہ احزاب کے موقع تمام کبار صحابہؓ اور قبائلی سرداروں کے ہوتے ہوئے، آپ ﷺ نے آزدہ کردہ غلام سیدنا سلمان فارسیؓ کے مشورے کو قبول کیا، جب کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے حضرت سلمان فارسیؓ کو اپنے دور خلافت میں مدائن کو گورنر بنایا[۳]۔

۱۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب لا یقال المملوک ربی و ربتی، حدیث نمبر: ۴۹۷۵

۲۔ الثعلبی، احمد بن محمد، الکشف والبیان عن تفسیر القرآن (دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۲۰۰۲ء) ۸: ۴۶

۳۔ تاریخ الطبری ۲: ۵۶۶

غلامی کے باب میں اسلام نے کون سی اصلاحات کیں، جو بتدریج اس کے خاتمے کا سبب بنیں؟

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اسلام کی آمد کے وقت غلامی کا جو تصور موجود تھا اور غلاموں کو جس صورت حال کا سامنا تھا، اس وقت کوئی اس کا راستہ روکنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، بلکہ ہر گزرتے دن کے ساتھ غلامی مزید بڑھ رہی تھی اور غلاموں کے حالات ابتر ہو رہے تھے۔ ان حالات میں غلامی کے نظام میں ایسی اصلاحات لانے کی ضرورت تھی، جو بتدریج اس نظام کے خاتمے کا سبب بنیں۔ بعد کے حالات کا جائزہ لیا جائے، تو یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اسلام نے ایسی اصلاحات پیش کیں، جن سے غیر محسوس طریقے سے غلامی کے راستے مسدود ہوئے، بلکہ وہ انتہائی حد تک محدود ہو گئی۔ ذیل میں اسلام کی انقلابی اصلاحات کا ذکر کیا جائے گا۔

استرقاق (غلام بنانے) کے راستوں کو محدود کرنا

اسلام سے پہلے ہر تہذیب و مذہب میں غلام بنانے کے مختلف طریقے رائج تھے، جن کی وجہ سے غلامی کا سلسلہ دن بدن وسیع ہوتا گیا، جیسے رومی سلطنت میں چوتھائی آبادی غلاموں پر مشتمل تھی۔ اسلام نے سب سے پہلے غلام بنانے کے تمام راستے بند کر دیے، صرف جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کا واحد راستہ باقی رہنے دیا۔ انگریز مصنف "Will Durant" اسی کے متعلق کہتے ہیں: اسلام نے غلامی کے دائرے کو تنگ کرنے اور غلاموں کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے کام کیا ہے، جائز غلامی کو جنگ میں گرفتار ہونے والے غیر مسلموں اور خود غلام کے بچوں تک محدود کر دیا ہے[1]۔ اس حکم سے غلاموں کی تعداد میں بجائے اضافہ ہونے کے روز بروز کمی آتی گئی۔

قدیم تہذیبوں و مذاہب میں قرض دار کو عدم ادائیگی پر غلام بنانا، آزاد انسان کو اغوا کر کے غلام بنا کر بیچنا، اپنے بچوں کو غلام بنا کر بیچنا جیسے مختلف طریقے رائج تھے، جس سے آزاد انسان کو غلام بنایا جاتا تھا۔ اسلام نے آزاد انسان غلام بنانے کی نا صرف حوصلہ شکنی کی، بلکہ اس کو جرم قرار

1. The Story of Civilization, 4: 209

دیا، حدیث قدسی میں آیا ہے: ثَلاَثَةٌ أَنَا خَصْمُهُمْ يَوْمَ القِيَامَةِ: رَجُلٌ أَعْطَى بِي ثُمَّ غَدَرَ، وَرَجُلٌ بَاعَ حُرًّا فَأَكَلَ ثَمَنَهُ، وَرَجُلٌ اسْتَأْجَرَ أَجِيرًا فَاسْتَوْفَى مِنْهُ وَلَمْ يُعْطِ أَجْرَهُ[۱] (تین طرح کے لوگ ایسے ہوں گے، جن کا قیامت کے دن میں مدعی بنوں گا: ایک وہ شخص جس نے میرے نام پر عہد کیا اور وہ توڑ دیا، دوسرا وہ جس نے کسی آزاد انسان کو بیچ کر اس کی قیمت کھائی اور تیسرا وہ شخص جس نے کوئی مزدور اجرت پر رکھا، اس سے پوری طرح کام لیا، لیکن اس کی مزدوری نہیں دی)۔

پھر دیکھا جائے تو غلامی کا جو ایک ہی راستہ جنگی قیدیوں کی صورت میں باقی رکھا، لیکن اس وقت جو طریقہ رائج تھا کہ مفتوح کے تمام افراد غلام بنائے جاتے اور پوری کی پوری آبادی ایک ملک سے دوسرے ملک منتقل ہو جاتی۔ فدیہ کے بدلے رہائی اور قیدیوں کے تبادلے کا تصور اس زمانے میں تقریباً نہ ہونے کے برابر تھا، لیکن اسلام نے فدیہ لے کر بھی جنگی قیدیوں کو رہا کیا اور بعض اوقات قیدیوں کا تبادلہ بھی کیا۔ جبکہ سب سے بڑھ کر اسلام نے دیگر تہذیبوں پر اخلاقی برتری دکھائی، وہ قیدیوں کی بغیر کسی معاوضہ اور بدلے کے رہائی تھی۔ سیرت طیبہ سے ثابت ہوتا ہے کہ دورِ نبوی میں کل ۶۵۶۴ جنگی قیدی بنائے گئے، جن میں ۶۳۴۷ قیدیوں کو جنگ کے اختتام پر آزاد کر دیا گیا، جبکہ چند قیدیوں کے متعلق ثابت ہوتا ہے کہ انہیں سابقہ جرائم کی پاداش میں سزائے موت دی گئی، جبکہ صرف باقی تقریباً دو سو قیدی ایسے ہیں، جن کو فوری آزادی نہیں دی گئی، یعنی غلام بنانے کے واحد راستے کو بھی محض چند مواقع پر عمل میں لایا گیا[۲]، جو رفتہ رفتہ غلامی کے خاتمے کا باعث بنا۔

۱۔ صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب اثم من باع حرا، حدیث نمبر: ۲۲۲۷

۲۔ مبارکپوری، مولانا قاضی اطہر، تدوین سیر و مغازی، (مقدمہ، عبد الجبار شاکر)، (بیت الحکمت، لاہور، ۲۰۰۵ء) ص: ک

حُریت کے وسائل فراہم کرنا

اسلام نے ایک طرف غلام بنانے کے راستے محدود کیے تو دوسری طرف غلاموں کو آزاد کرنے کے راستے کھول دیے۔ ذیل میں غلاموں کی آزادی کے لیے جاری احکامات کو ذکر کیا جائے گا:

ا: ترغیب

ابتدا میں غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب دی گئی اور اسے اخروی نجات کا باعث قرار دیا گیا، سورۃ البقرۃ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ﴾ [البقرۃ۲: ۱۷۷] (بلکہ نیکی تو یہ ہے جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لائے، فرشتوں، کتابوں، نبیوں پر اور اس کی محبت میں رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سوال کرنے والوں کو اور گردنوں کے چھڑانے میں مال دے)۔

اسی طرح حدیث مبارک میں آیا ہے: من أعتق رقبة مؤمنة، أعتق الله منه بكل عضو منه عضوا من النار[۱] (جس نے ایک مومن غلام کو آزاد کیا، اللہ اس غلام کے ہر عضو کے بدلے آزاد کرنے والے کے ایک ایک عضو کو جہنم سے آزاد کرے گا)۔

ایک اور جگہ فرمایا: وَمَنْ أَعْتَقَ نَفْسًا مُسْلِمَةً، كَانَتْ فِدْيَتَهُ مِنْ جَهَنَّمَ[۲] (جس نے مسلمان غلام آزاد کیا، تو یہ اس کے لیے جہنم سے فدیہ ہوا)۔

غلاموں کو آزاد کرنے کی اس ترغیب کا اثر تھا کہ مسلمانوں نے بڑی تعداد میں غلاموں اور باندیوں کو خرید کر ان کو آزاد کیا، رسول اللہ ﷺ نے اس کام کی ابتدا خود اپنے آپ سے فرمائی

۱۔ سنن ترمذی، کتاب النذور والأیمان عن رسول اللہ ﷺ، باب ماجاء فی ثواب من اعتق رقبۃ، حدیث نمبر: ۱۵۴۱

۲۔ مسند الامام احمد بن حنبل، مسند الکوفیین، حدیث عمرو بن عبسۃ، حدیث نمبر: ۱۹۴۴۰

اور ۶۳ غلاموں کو آزاد کیا، جب کہ صحابہ کرامؓ میں حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ نے ۳۰ ہزار، ذوالکلاع حمیریؓ نے ۸ ہزار اور حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے ۱۰۰۰، حکیم بن حزامؓ نے ۱۰۰، حضرت عباسؓ نے ۷۰ اور سیدہ عائشہؓ نے ۶۷ غلام آزاد کیے۔ ان چند صحابہ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد تقریباً ۴۰ ہزار تک پہنچتی ہے، اس کے علاوہ حضرت ابو بکرؓ، حضرت عثمانؓ وغیرہ نے بھی کثرت سے غلام آزاد کیے[۱]۔

۲: مصارف زکاۃ

ترغیب کے ساتھ ساتھ غلاموں کو آزاد کرنے میں مدد وتعاون کو مصارف زکاۃ میں بھی شامل کیا، سورۃ التوبہ میں ارشاد ربانی ہے: ﴿إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللهِ وَابْنِ السَّبِيلِ﴾ [التوبۃ:۹: ۶۰] (زکاۃ مفلسوں اور محتاجوں اور اس کا کام کرنے والوں کا حق ہے اور جن کی دلجوئی کرنی ہے اور غلاموں کی گردن چھڑانے میں اور قرض داروں کے قرض میں اور اللہ کی راہ میں اور مسافر کو)۔

علامہ قرطبی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: فَيَجُوزُ لِلْإِمَامِ أَنْ يَشْتَرِيَ رِقَابًا مِنْ مَالِ الصَّدَقَةِ، يُعْتِقُهَا عَنِ الْمُسْلِمِينَ، وَيَكُونُ وَلَاؤُهُمْ لِجَمَاعَةِ الْمُسْلِمِينَ، وَإِنِ اشْتَرَاهُمْ صَاحِبُ الزَّكَاةِ وَأَعْتَقَهُمْ جَازَ[۲] (پس امام کے لیے جائز ہے کہ وہ صدقہ کے مال سے غلام خرید کر مسلمانوں کی طرف سے آزاد کرے اور اس کا ولاء مسلمانوں کی جماعت کے لیے ہوگی۔ اگر صاحب نصاب (زکاۃ کے مال سے) غلام خرید کر آزاد کرے تو جائز ہے)۔

۳: کفارات میں تحریر رقبہ

اسلام نے مختلف قسم کے گناہوں کے کفارہ میں بھی غلاموں کی آزادی لازم کر دی، تاکہ زیادہ سے زیادہ غلاموں کی آزادی ممکن بنائی جائے۔

۱۔ ابو البقاء الشافعی، محمد بن موسیٰ، نجم الوہاج فی شرح المنہاج (دار المنہاج، جدہ، ۲۰۰۴ء) ۱۰: ۴۶۳

۲۔ القرطبی، محمد بن احمد، الجامع لاحکام القرآن = تفسیر قرطبی (دار الکتب المصریۃ، القاہرۃ، ۱۹۶۴ء) ۸ : ۱۸۲

(الف) کفارۂ قتل: قتلِ خطا میں قرآن کریم نے دیت کے ساتھ بطور کفارہ غلام آزاد کرنے کا حکم دیا ہے، سورۃ النساء میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَأً وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَى أَهْلِهِ إِلَّا أَنْ يَصَّدَّقُوا فَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ فَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَى أَهْلِهِ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ﴾ [النساء۴: ۹۲] (اور مسلمانوں کا یہ کام نہیں کہ کسی مسلمان کو قتل کرے مگر غلطی سے اور جو مسلمان کو غلطی سے قتل کرے تو ایک مسلمان کی گردن آزاد کرے اور مقتول کے وارثوں کو خون بہا دے مگر یہ کہ وہ خون بہا معاف کر دیں، پھر اگر وہ مسلمان مقتول کسی ایسی قوم میں تھا جس سے تمہاری دشمنی ہے تو ایک مومن غلام آزاد کرنا ہے، اور اگر وہ مقتول مسلمان کسی ایسی قوم میں سے تھا جس سے تمہارا معاہدہ ہے تو اس کے وارثوں کو خون بہا دیا جائے گا اور ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہو گا)۔

محمد قطب کہتے ہیں کہ قتل کی صورت میں قاتل نے ورثا کے ساتھ معاشرہ کو بھی نقصان پہنچایا ہے، اس لیے ورثا کو خون بہا دینے کے ساتھ ساتھ اسے معاشرے کے نقصان کی تلافی کا پابند بنایا گیا اور اس کی صورت یہ ہوئی کہ اسے غلام کو آزاد کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے نزدیک غلامی موت یا اس سے ملتی جلتی کیفیت کا نام ہے[۱]۔

(ب) کفارۂ یمین: اگر کوئی مسلمان مستقبل میں کسی بات کے کرنے یا نہ کرنے کی قسم (یمینِ منعقدہ) کھالے اور اسے پھر پورا نہ کرے اور قسم توڑ دے، تو اس پر بطور کفارہ مختلف امور لازم ہوتے ہیں، جن میں ایک غلام کا آزاد کرنا بھی شامل ہے، سورۃ المائدۃ میں ارشاد ربانی ہے: ﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ وَلَكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُمُ الْأَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِينَ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعِمُونَ أَهْلِيكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ أَوْ تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ

۱۔ محمد قطب، شبہات حول الاسلام، (دار الشروق، القاہرۃ، ۱۹۸۸ء) ص: ۴۵

فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ ذَلِكَ كَفَّارَةُ أَيْمَانِكُمْ إِذَا حَلَفْتُمْ﴾ [المائدۃ۵: ۸۹] (اللہ تمہیں تمہاری فضول قسموں پر نہیں پکڑتا لیکن ان قسموں پر پکڑتا ہے جن پر تم اپنے آپ کو پابند کرو، سو اس کا کفارہ دس مسکینوں کو اوسط درجہ کا کھانا دینا ہے (ایسا کھانا) جو تم اپنے گھر والوں کو دیتے ہو یا دس مسکینوں کو کپڑا پہنانا یا گردن (غلام) آزاد کرنا، پھر جو شخص یہ نہ کر پائے تو پھر تین دن کے روزے رکھنے ہیں، یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب تم قسم کھاؤ)۔

(ج) کفارۂ ظہار: اگر کوئی مسلمان اپنی بیوی کو محرمات ابدیہ (ماں، بہن) سے تشبیہ دے، تو وہ بیوی اس پر حرام ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ اپنی اس بات کا کفارہ ادا نہ کرے، کفارۂ ظہار میں دیگر امور کے ساتھ تحریر رقبہ بھی شامل ہے، سورۃ المجادلۃ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَالَّذِينَ يُظَاهِرُونَ مِنْ نِسَائِهِمْ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا قَالُوا فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَتَمَاسَّا﴾ [المجادلۃ۵۸: ۳] (اور جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں پھر اس کہی ہوئی بات سے پھرنا چاہیں تو ایک دوسرے کو ہاتھ لگانے سے پہلے ایک غلام آزاد کر دیں)۔

(د) کفارۂ صوم: اگر کوئی رمضان المبارک کا روزہ بغیر کسی شرعی عذر کے توڑ دے تو اس پر تین امور میں سے ایک لازم ہوتا ہے، جن میں غلام کا آزاد کرنا بھی شامل ہے۔ ایک صحابیؓ نے رمضان المبارک میں روزہ بغیر کسی شرعی عذر کے توڑ دیا اور رسول اللہ ﷺ سے اس کے کفارہ کے متعلق استفسار کیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: هَلْ تَجِدُ رَقَبَةً تُعْتِقُهَا؟[1] (کیا تمہیں کوئی غلام میسر ہے جسے تم (کفارہ میں) آزاد کر دو)۔

(ہ) دوسرے گناہوں کا کفارہ: بعض دیگر گناہوں اور خطاؤں کے بعد بھی احادیث مبارکہ میں غلام آزاد کرنے کا تذکرہ ملتا ہے، جیسے صحیح مسلم کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مَنْ لَطَمَ

۱۔ صحیح بخاری، کتاب النفقات، باب نفقۃ المعسر علی اہلہ، حدیث نمبر: ۵۳۶۸

مَمْلُوكَهُ، أَوْ ضَرَبَهُ، فَكَفَّارَتُهُ أَنْ يُعْتِقَهُ[۱] (جس نے اپنے غلام کو تھپڑ مارا یا اسے زدوکوب کیا، تو اس غلام کا آزاد کرنا اس کا کفارہ ہے)۔

۴: حریت کے دیگر اسباب

غلاموں کی آزادی کے لیے اسلام نے ایسے اسباب کی طرف رہنمائی کی، جن کا پہلے کوئی تصور نہ تھا، ذیل میں حریت رقبہ کے چند اسباب کو ذکر کیا جائے گا:

(الف) مکاتبت: عقد مکاتبت سے مراد یہ ہے کہ آقا غلام سے مال کی کچھ معین مقدار کے بدلے آزاد کرنے کا معاہدہ کرے۔ سورۃ النور میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَالَّذِينَ يَبْتَغُونَ الْكِتَابَ مِمَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوهُمْ إِنْ عَلِمْتُمْ فِيهِمْ خَيْرًا وَآتُوهُمْ مِنْ مَالِ اللهِ الَّذِي آتَاكُمْ﴾ [النور ۲۴: ۳۳] (اور تمہارے غلاموں میں سے جو لوگ مال دے کر آزادی کی تحریر چاہیں تو انہیں لکھ دو بشرطیکہ ان میں بہتری کے آثار پاؤ، اور انہیں اللہ کے مال میں سے دو جو اس نے تمہیں دیا ہے)۔

اگر غلام آقا سے خود مکاتبت کا معاہدہ کرنا چاہے، تو بعض ائمہ کے نزدیک آقا پر اس کے ساتھ عقد مکاتبت کرنا واجب ہے، جب کہ بعض کے نزدیک آقا کو عقد کرنے یا نہ کرنے کا اختیار حاصل ہے[۲]۔ اس کے ساتھ ﴿وَآتُوهُمْ مِنْ مَالِ اللهِ الَّذِي آتَاكُمْ﴾ فرما کر معاشرہ کو بھی مالِ کتابت کی ادائیگی میں غلام کی مدد کرنے کی ترغیب دی اور جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ اس کو زکاۃ کا مصرف بنا کر غلام کے لیے ادائیگی میں سہولت پیدا کر دی۔ اس میں آقا کو بھی اس بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ مالِ کتابت میں کمی کر کے غلام کے لیے آسانی پیدا کریں۔

(ب) ام ولد: ام ولد اس باندی کو کہا جاتا ہے، جو اپنے آقا کے بچے کی ماں بنتی ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ آقا کی موت کے ساتھ ہی یہ باندی آزاد ہو جاتی ہے، آقا کے لیے ام ولد کا فروخت کرنا منع قرار

۱۔ صحیح مسلم، کتاب الأیمان، باب صحبۃ المالیک، حدیث نمبر: ۱۶۵۷

۲۔ تفسیر قرطبی ۱۲: ۲۴۵

دیا گیا ہے، حدیث مبارک ہے: أَيُّمَا رَجُلٍ وَلَدَتْ أَمَتُهُ مِنْهُ، فَهِيَ مُعْتَقَةٌ عَنْ دُبُرٍ مِنْهُ[۱] (جو باندی اپنے مالک کا بچہ جنے، تو وہ مالک کے مر جانے کے بعد آزاد ہو جائے گی)۔

سیدنا عمرؓ نے ایسی باندی کی بیع وشرا کو مکمل طور پر ممنوع قرار دے دیا تھا: ام ولد کی بیع ناجائز ہے، جب باندی اپنے آقا کے لیے بچے جنے، تو اس کے بعد وہ باندی نہیں رہتی[۲]۔

رسول اللہ ﷺ نے باندیوں خصوصاً جن سے آقا جنسی تعلق رکھتے، کی آزادی یقینی بنانے کے لیے عزل کو ناپسندیدہ عمل قرار دیا: عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الخُدْرِيِّ، قَالَ: أَصَبْنَا سَبْيًا، فَكُنَّا نَعْزِلُ، فَسَأَلْنَا رَسُولَ اللهِ ﷺ، فَقَالَ أَوَ إِنَّكُمْ لَتَفْعَلُونَ- قَالَهَا ثَلاَثًا- مَا مِنْ نَسَمَةٍ كَائِنَةٍ إِلَى يَوْمِ القِيَامَةِ إِلَّا هِيَ كَائِنَةٌ[۳] (ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ (ایک غزوہ میں) ہمیں قیدی عورتیں ملیں اور ہم نے ان سے عزل کیا۔ پھر ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا حکم پوچھا، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم واقعی ایسا کرتے ہو؟ (تین مرتبہ آپ ﷺ نے یہ فرمایا)، پھر فرمایا (قیامت تک جو روح بھی پیدا ہونے والی ہے وہ) اپنے وقت پر پیدا ہو کر رہے گی۔ پس تمہارا عزل کرنا عبث ہے)۔

(ج) مدبر بنانا (تدبیر): مدبر اس غلام کو کہتے ہیں، جس کو آقا کہے کہ تم میری موت کے بعد آزاد ہو گے، اس کا حکم یہ ہے کہ آقا کی موت کے ساتھ ہی غلام آزاد ہو جاتا ہے۔ وہ غلام آزاد کر کے اجر وثواب کے مستحق بننا چاہتے ہیں، لیکن اپنی ضروریات کی وجہ سے اپنی زندگی میں ایسا کرنا ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا، تو اپنے غلام کو مدبر بنا کر موت کے بعد اس ثواب کے مستحق بن سکتے ہیں۔ اس عمل کی مشروعیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے غلاموں کی آزادی کا ہر ممکن راستہ کھول دیا ہے۔ بعض صحابہؓ ام ولد کی طرح مدبر غلام کی بیع کو جائز نہیں سمجھتے۔ اگر مدبرہ باندی اپنے آقا کے سوا کسی اور سے حاملہ ہو، تو آقا کی موت کے ساتھ ہی وہ بچہ بھی آزاد ہو جائے گا۔ سنن

۱۔ سنن ابن ماجہ، کتاب العتق، باب امہات الاولاد، حدیث نمبر: ۲۵۱۵

۲۔ ابو یوسف، یعقوب بن ابراہیم، کتاب الآثار، فی المکاتب والمدبر وام الولد، حدیث نمبر: ۸۷۲

۳۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب العزل، حدیث نمبر: ۵۲۱۰

بیہقی کی روایت ہے: الْمُدَبَّرَةُ وَلَدُهَا بِمَنْزِلَتِهَا إِذَا وَلَدَتْ وَهِيَ مُدَبَّرَةٌ[۱] (مدبرہ باندی اگر مدبرہ ہوتے ہوئے بچہ جنے تو وہ بھی اس کے حکم میں ہو گا)۔

اسلام نے غلامی کو دیگر برائیوں کی طرح یکسر ختم کیوں نہیں کیا؟

اب تک کی بحث سے یہ بات سامنے آچکی ہے کہ غلامی اسلام کو ورثے میں ملی اور اسلام نے قدیم تہذیبوں اور عرب معاشرے میں رائج غلامی کے تصور کے بالکل برعکس غلاموں کو معاشرے میں برابری کا مقام دیا اور غلاموں سے روا رکھے جانے والے امور کی بہترین طریقے سے اصلاح کی، لیکن سوال یہ ہے کہ اسلام نے معاشرے کے ہر ظالمانہ رواج اور طریقے کا خاتمہ کیا، تو غلامی کو یکسر ختم کرنے کے احکامات کیوں نہیں دیے؟ ذیل میں اس امر کی چند حکمتیں ذکر کی جاتی ہیں:

ا: اخلاقی و معاشی پہلو

ایک ایسا معاشرہ جس کے تار و پود میں غلامی رچ بس چکی تھی، سے یکسر غلامی ختم کر دینے کے اخلاقی و معاشی پہلو کے متعلق سید امیر علی "The Spirit of Islam" میں لکھتے ہیں:

It is naturally to be expected many of the pre-Islamite institutions, which were eventually abolished, were at first either tacitly permitted or expressly recognized .In one of these categories stood the usage of slavery. The evil was intertwined with the inmost relations of the people among whom Mohammed flourished. Its extinction was only to be achieved by the continued agency of wise and humane laws, and not by the sudden and entire emancipation of the existing slaves, which was morally and economically impossible. Numberless provisions, negative as well as positive, were accordingly introduced in order to promote and accomplish a gradual enfranchisement. A contrary

---

۱۔ البیہقی، احمد بن الحسین، سنن الکبریٰ، کتاب المدبر، باب ماجاء فی ولد المدبرۃ، حدیث نمبر: ۲۱۵۸۵

policy would have produced an utter collapse of the infant Commonwealth.

ماقبلِ اسلام کے بہت سے دستور جو بعد میں منسوخ ہوگئے، شروع شروع میں یا تو خاموشی سے جاری رہنے دیے گئے یا اعلانیہ قانوناً تسلیم کر لیے گئے، انہی میں سے ایک غلامی کا دستور تھا، یہ ایک برائی تھی جو عربوں کے گہرے سے گہرے باہمی تعلقات میں داخل تھی۔ اسے محو کرنے کا طریقہ یہ نہ تھا کہ جتنے غلام اس وقت موجود تھے، ان سب کو فی الفور آزادی دے دی جاتی، جو کہ اخلاقی اور معاشی نقطۂ نگاہ سے ناممکن تھا، بلکہ یہ کہ حکیمانہ اور انسانیت نواز قوانین کے ذریعے آہستہ آہستہ زائل کیا جاتا، چنانچہ بہت سے سلبی اور ایجابی قوانین غلاموں کی آزادی کو رفتہ رفتہ ممکن بنانے کی خاطر وضع کیے گئے۔ اگر اس کے مخالف کوئی طریق عمل اختیار کیا جاتا تو نوزائیدہ جمہوریت کی عمارت زمیں بوس ہو جاتی۔[1]

یہاں ذہن میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر جنگی قیدیوں کو آزاد کرنا ممکن نہ تھا، تو گرفتار افراد کو مستقل طور پر قید بھی کیا جا سکتا تھا، اس کے متعلق علامہ زاہد الراشدی لکھتے ہیں:

جنگی قیدیوں کے معاملے میں غلامی کو برقرار رکھنے کی ایک حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس زمانے میں باقاعدہ قید خانے اس انداز سے نہیں ہوتے تھے کہ ان میں ہزاروں افراد کو منظم طور پر سالہا سال تک قید میں رکھا جا سکتا، اس لیے جن قیدیوں کو قید میں رکھنا ضروری ہوتا تھا، ان کے لیے عملی صورت یہی ممکن تھی کہ انھیں تقسیم کر دیا جائے اور وہ ریاست کے قیدی بننے کے بجائے افراد اور خاندانوں کے قیدی رہیں۔ جن لوگوں نے زندگی بھر قید میں رہنا ہے، خود ان کے لیے بھی بہتر صورت یہ تھی کہ انھیں قید خانوں میں ڈالنے کے بجائے افراد اور خاندانوں میں تقسیم کر دیا جائے، تاکہ وہ قیدی ہونے کے باوجود زندگی کی مناسب سہولتوں اور حقوق سے کسی حد تک بہرہ ور

1. Syed, Ameer Ali, The Spirit of Islam,(Forgotten Books, London, 2014) P:221

ہو سکیں۔ اس کی عملی شکل آج کے دور میں دیکھنی ہو تو جیل خانوں میں بند قیدیوں اور اچھا کردار رکھنے والے قیدیوں کو پیرول پر مختلف خاندانوں میں نیم قیدیوں کی صورت میں تقسیم کیے جانے والے قیدیوں کا موازنہ کر لیا جائے[۱]۔

۲: معاشرتی پہلو

غلامی کو یکسر ختم نہ کرنے کی ایک وجہ اس کا معاشرتی پہلو ہے کہ بعض اوقات جنگوں میں کسی قبیلے کے اکثر مرد قتل ہو جاتے اور پیچھے بچے اور عورتیں رہ جاتیں، ان بچوں و عورتوں کی معاشی ضروریات پوری کرنا بھی کوئی آسان کام نہ تھا، ان کی اخلاقی نگرانی اس سے زیادہ اہم معاملہ تھا، لہٰذا غلامی کی صورت میں ان کی معاشی و اخلاقی نگرانی کا ایک انتظام موجود تھا، جس کو فی الفور ختم کرنا معاشرہ میں بہت سے مفاسد پیدا کر سکتا تھا، ڈاکٹر ابراہیم حسن اسی پہلو کے متعلق لکھتے ہیں:

"دوسری وجہ یہ ہے کہ اس طرح ان کمزور عورتوں کی مدد و اعانت ہو جاتی، جن کے مرد جنگ میں قتل ہو چکے ہیں، اگر ان کو یونہی چھوڑ دیا جاتا، تو معاشرہ مصیبت میں پڑ جاتا اور یہ مختلف مفاسد کا سبب بنتا۔"[۲]

اسی طرح وہ معاشرہ اور لوگ غلاموں سے خدمت لینے کے عادی تھے اور ایک بڑے طبقے کی زراعت و تجارت کا انحصار غلاموں پر تھا، تو اگر ایک دم غلامی کا سلسلہ ختم کر دیا جاتا، تو بہت سے معاشرتی مسائل جنم لے سکتے تھے، لہٰذا ایک وقت تک اس نظام کو برداشت کر لیا گیا اور تدریجی طور پر اس کے خاتمے کے لیے احکامات جاری کیے گئے۔

۳: نفسیاتی پہلو

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ غلامی جس طرح معاشرے خصوصاً عرب قوم کی رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی، اس کو غلاموں کی نفسیاتی تربیت کے بغیر یکسر ختم کرنا ایک معاشرتی المیہ

۱۔ الراشدی، ابو عمار زاہد الراشدی، غلامی کے مسئلے پر ایک نظر (ماہنامہ الشریعہ، جلد ۱۷، شمارہ نمبر ۱۰، اکتوبر ۲۰۰۶ء) ص: ۲۳

۲۔ تاریخ الاسلام السیاسی، ۱: ۲۳۱

کو جنم دے سکتا تھا، محمد قطبؒ اس بابت امریکی تجربہ کی ناکامی کو بطور استدلال ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "امریکی قوم نے اس سلسلے میں جو تجربہ کیا، وہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے، امریکی صدر ابراہیم لنکن نے بیک جنبش قلم غلاموں کی آزادی کا فرمان جاری کر دیا، لیکن وہ غلام جنہیں لنکن نے آزاد کیا وہ ذہنی وروحانی طور پر آزادی کے لیے تیار نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں اکثر اپنے سابقہ آقاؤں کے پاس جاتے اور ان سے درخواست کرتے کہ انہیں اپنے پاس پہلے کی طرح گھروں میں رکھیں کیونکہ وہ ذہنی طور پر اب بھی غلام تھے۔"[1]

اسلام نے پہلے غلاموں کے نفسیاتی پہلو پر کام کیا اور انہیں برابر کا انسان ہونے کا یقین دلایا، تب جاکر وہ ان کے دل میں آزادی کی خواہش پیدا ہوئی اور آزادی کے بعد انہوں نے بحیثیت شہری ایک اچھی زندگی گزاری۔

۴: سیاسی پہلو

اس زمانے میں جب ہر طرف غلام بنانے کا رواج تھا، تو اگر مسلمان یک طرفہ طور پر جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کی پالیسی یکسر ختم کر لیتے اور فدیہ یا بغیر فدیہ کے جنگی قیدیوں کو رہا کرتے، تو ایک طرف دشمن مسلمانوں کے خلاف جری ہو جاتے اور دوسری طرف دشمن اور مسلمانوں کی افرادی قوت میں بہت بڑا عدم توازن پیدا ہو جاتا۔ ڈاکٹر ابراہیم حسن لکھتے ہیں: "غلامی کو باقی رکھنے کی پہلی وجہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت اور دشمنوں میں توازن باقی رہے۔"[2]

لہٰذا جب تک اس وقت کی دیگر حکومتیں غلامی پر مکمل پابندی پر راضی نہ ہوتیں، مسلمانوں کے لیے ایسا کرنا ناممکن تھا اور دوسری حکومتوں کا اپنے معاشرتی، سیاسی اور معاشی شعبوں سے منسلک اس نظام کو یکسر ختم کرنا اور ان کو اس پر راضی کرنا کس طرح ممکن ہو سکتا تھا؟

۱۔ شبہات حول الاسلام، ص: ۴۷

۲۔ ابراہیم، الدکتور ابراہیم حسن، تاریخ الاسلام السیاسی (مطبعۃ حجازی، القاہرۃ، ۱۹۳۵ء)، ۱: ۲۳۱

باندیوں سے تمتع کو ممنوع قرار نہ دینے کی حکمت

دورِ حاضر میں جنگ کے دوران جنسی تشدد کے حوالے سے بحث میں باندیوں سے تمتع کے جواز پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسلام نے اس کو فی الفور ممنوع قرار کیوں نہیں دیا؟

قدیم تہذیبوں اور زمانۂ جاہلیت میں عرب معاشرے کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غلامی کے نظام میں سب سے زیادہ ظلم کا نشانہ باندیاں بنی ہیں، جن کو مشترکہ ملکیت سمجھا جاتا تھا، یہاں تک انہیں قحبہ گری پر مجبور کیا جاتا تھا۔ اس کے مقابلے میں اسلام نے باندیوں کو مکمل تحفظ فراہم کیا، مولانا مودودی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> بعض اوقات لڑائیوں میں ایک شہر کے مردوں کا اکثر حصہ کام آجاتا تھا، بلکہ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ ایک بستی کے تمام ہتھیار اٹھانے کے قابل آدمی قتل ہو جاتے تھے۔ ایسی حالت میں لاوارث عورتوں اور بچوں کی پرورش کا انتظام اس کے سوا اور کسی صورت سے نہ ہو سکتا تھا کہ خود فاتح قوم اس کی ذمہ داری اپنے سر لے اور جب یہ کام فاتحین ہی کو کرنا تھا تو عورتوں کی حفاظت اور سوسائٹی میں ان کی وقعت قائم رکھنے کے لیے اس سے بہتر صورت اور کیا ہو سکتی تھی کہ مسلمان مردوں کو ان سے ازدواجی تعلق قائم کرنے کی اجازت دے دی جاتی۔ اس صورت سے وہ اسلامی سوسائٹی کی رکن بن گئیں اور ان مفاسد کا دروازہ بند ہو گیا۔ جو ہزاروں عورتوں کے بے شوہر رہ جانے سے لازمی طور پر پیدا ہوتے[۱]۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ قدیم تہذیبوں کے برعکس اسلام نے باندیوں سے تمتع کی اجازت چند حدود و قیود کے تحت دی، جیسے قدیم تہذیبوں میں جنگی قیدی عورت جس کے ہاتھ لگ جاتی اس کی ہوتی، لیکن اسلام نے ضابطہ یہ بنایا کہ غنیمت کی تقسیم تک قیدی عورت حکومت کی ملکیت ہوتی اور جب حاکم کسی کو اس کی ملکیت دیتا، تو اس کے بعد وہ اس سے جنسی تعلق قائم کر سکتا تھا۔ لیکن

۱۔ مودودی، سید ابوالاعلیٰ مودودی، الجہاد فی الاسلام (ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۹۶ء) ص: ۲۵۴، ۲۵۵

مقاصد شریعت میں شامل حفاظت نسب کی وجہ سے اسلام نے باندی کے مالک کو اس سے فوری طور پر تمتع کی اجازت نہیں دی، بلکہ اس کے استبراءِ رحم[۱] کی شرط عائد کر دی اور حاملہ باندی کے ساتھ بھی وضع حمل تک جنسی تعلق بھی ممنوع قرار دی ہے۔ اس کے ساتھ مالک کے تمتع کے بعد کسی اور کے لیے اس باندی سے جنسی تعلق قائم کرنا ممنوع قرار دے دیا اور اگر آقا نے باندی کا نکاح کسی سے کروا دیا، تو پھر وہ خود اس کے لیے تمتع حرام ہو گیا[۲]۔

مذکورہ بالا قواعد وضوابط کی خلاف ورزی قانونِ اسلامی میں سنگین جرم تصور کی جاتی ہے، جیسے غنیمت کی تقسیم سے پہلے کسی سپاہی نے قیدی عورت کے ساتھ جنسی تعلق قائم کیا، تو یہ زنا کے زمرہ میں آئے گا اور اس سپاہی کو سزا دی جائے گی۔ آقا کے علاوہ کوئی اور باندی سے مباشرت کرے گا، تو وہ زنا کا مجرم ہو گا، اسی طرح استبراء رحم سے پہلے تمتع بھی حرام وناجائز ہے[۳]، دیکھا جائے تو ان شرائط کی موجودگی میں باندی سے جنسی تعلق صورتاً نکاح ہی کی طرح ہے کہ باندی صرف ایک شخص ہی کی ملکیت میں رہے گی اور صرف وہی اس سے جنسی تعلق قائم رکھ سکتا ہے اور اگر وہ کسی دوسرے کو نکاح میں یا ملکیتاً دیتا ہے، تو اس آقا کے لیے جنسی تعلق ممنوع ہو جائے گا اور دوسرے کے لیے جنسی تعلق بنانے سے پہلے استبراء رحم لازم ہو گا، جس کی صورت عدت طلاق کی بنتی ہے۔ اسی طرح دوران حمل بھی اس سے جنسی تعلق رکھنا ناجائز قرار دیا گیا ہے۔

باندیوں سے تمتع کی حکمت جاننے کے بعد یہ معلوم ہونا بھی ضروری ہے کہ اسلام نے باندیوں کو مکمل طور پر معاشرہ کا حصہ بنانے کے لیے بغیر نکاح جنسی تعلق کی بجائے نکاح کرنے کی ترغیب دی، خود رسول اللہ ﷺ نے قید میں آنے والی عورتوں کو آزاد کر کے باقاعدہ اپنے نکاح میں داخل کیا اور اپنے ارشادات کے ذریعے مسلمانوں کو بھی باندیوں کی تعلیم وتربیت کے ساتھ، انہیں

۱۔ باندی سے تمتع کرنے سے پہلے اس کی ماہواری آنے کا انتظار کرنا تاکہ یقین ہو جائے کہ اس کا رحم حمل سے خالی ہے۔ (البرکتی، محمد عمیم الاحسان، التعریفات الفقہیہ، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۰۳ء، ص: ۲۳)

۲۔ مودودی، سید ابو الاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن (ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۲۰۱۲ء) ۱: ۳۴۰

۳۔ گولن، محمد فتح اللہ، اسلام اور دورِ حاضر، مترجم، محمد اسلام (ہارمنی پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء) ص، ۲۵۰

آزاد کرنے اوران سے نکاح کی ترغیب دی، فرمان نبوی ﷺ ہے: وَرَجُلٌ كَانَتْ عِنْدَهُ أَمَةٌ فَأَدَّبَهَا، فَأَحْسَنَ تَأْدِيبَهَا، وَعَلَّمَهَا فَأَحْسَنَ تَعْلِيمَهَا، ثُمَّ أَعْتَقَهَا فتَزَوَّجَهَا فَلَهُ أَجْرَانِ[1] (اور وہ شخص جس کی کوئی باندی ہو اور وہ اس کو بہترین ادب سکھائے، عمدہ تعلیم دے اور پھر اس کو آزاد کر کے، اس سے شادی کرے، تو اس کے لیے دوگنا اجر ہے)۔

بلکہ آزاد عورت سے نکاح کی طاقت نہ رکھنے والوں کو باندیوں سے نکاح کی ترغیب دی گئی: ﴿وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا أَنْ يَنْكِحَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ فَمِنْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ مِنْ فَتَيَاتِكُمُ الْمُؤْمِنَاتِ﴾ [النساء۴: ۲۵] (تم میں سے جو آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو، تو ان عورتوں سے نکاح کرلے، جو تمہاری ملکیت میں ہیں، یعنی تمہاری مومن باندیاں)۔

لیکن اگر کوئی خود اپنی باندی کو آزاد نہیں کرنا چاہتا اور نہ اس سے نکاح کرنے کا خواہش مند ہے، تو اسلام اسے ترغیب دیتا ہے کہ اس کا نکاح کسی دوسرے سے کرائے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَى مِنْكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ﴾ [النور۲۴: ۳۲] (اور اپنے غیر شادی شدہ، نیز غلاموں اور باندیوں میں جو نکاح کے لائق ہوں، ان کا نکاح کر دو)۔

باندیوں کی معاشرت کا معاملہ اسلام کی نظر میں اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ معزز خاندانوں کی مشرکہ عورتوں کے مقابلہ میں باندیوں سے نکاح بہتر قرار دیا، سورۃ البقرۃ میں ارشاد ربانی ہے: ﴿وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّى يُؤْمِنَّ وَلَأَمَةٌ مُؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِنْ مُشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ﴾ [البقرۃ۲: ۲۲۱] (اور مشرک عورتوں سے اس وقت تک نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ یقیناً ایک مومن باندی کسی بھی مشرک عورت سے بہتر ہے، خواہ وہ مشرک عورت تمہیں پسند آرہی ہو)۔

۱۔ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب تعلیم الرجل وامتہ، حدیث نمبر: ۹۷

مندرجہ بالا بحث سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اسلام کا باندیوں سے تمتع کی اجازت محض شہوانی خواہشات پوری کرنے کے لیے نہیں، بلکہ زمانۂ قدیم سے رائج بوسیدہ رسوم ورواج اور غلط طریقوں کو ختم کرنے کی طرف تدریجی کوشش ہے۔

البتہ ایک بات سمجھنے کی ہے کہ بعض لوگ مختلف مسلمان خلفا کے ذاتی عمل کو بنیاد بنا کر اس کو اسلام سے منسوب کرتے ہیں، یہ بات اتنی ہی غلط ہے، جیسے آج کے کسی حکمران کے ذاتی عمل کو اس کے مذہب کی طرف منسوب کرنا، محمد قطب اس کے متعلق لکھتے ہیں: "بعد کے ادوار میں غلامی، انسانوں کی خرید وفروخت اور ان کی تجارت کی مثالیں ممالکِ اسلامیہ کی تاریخ میں ملتی ہیں، یہ کسی صورت جائز نہیں اور ان سے اسلام کا کوئی واسطہ نہیں۔ جس طرح موجودہ مسلم حکمرانوں کے جرائم کو اسلام کی جانب منسوب کرنا غلط ہے، اس طرح غلامی کی ان صورتوں کا اسلام کی جانب انتساب بھی صحیح نہیں"۔[1]

کیا موجودہ دور میں مسلمانوں کے لیے کسی کو غلام بنانا شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟

موجودہ زمانے میں مسلمان ممالک کے لیے یا ان مسلح گروہوں کے لیے جو خود کو اسلام کی طرف منسوب کرتے ہیں، شرعاً غلام بنانا جائز ہے یا نہیں؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے ان عالمی قوانین ومعاہدات کا جائزہ لینا ضروری ہے، جن پر مسلمان ممالک نے دستخط کیے ہیں۔

حقوقِ انسانی کے عالمی منشور (Universal Declaration on Human Rights)، جس کو تمام ممالک تسلیم کرتے ہیں، میں غلامی کی تمام اقسام کو ممنوع قرار دیا گیا ہے: کسی کو غلام بنا کر نہ رکھا جائے؛ غلامی اور غلاموں کے تجارت کی تمام صورتیں ممنوع ہیں[2]۔

۱۔ شبہات حول الاسلام، ص:۵۷

2. Universal Declaration on Human Rights, Article:4

جنیوا کنونشن کے دوسرے اضافی پروٹوکول (Additional Protocol) میں ہر قسم کی غلامی اور غلاموں کی تجارت کی ہر صورت کو ممنوع قرار دیا گیا ہے: "غلامی اور غلاموں کی تجارت کی تمام قسمیں، ہر وقت اور ہر جگہ بہر صورت ممنوع ہیں۔"[1]

ان معاہدات پر تمام اسلامی ممالک نے دستخط کر کے خود پر لاگو کیا ہے، جب کہ یہ واضح طور پر غلامی کو جرم اور غیر قانونی قرار دے رہے ہیں، لہٰذا اس صورت میں مسلمانوں نے عالمی معاہدات کے تحت غلامی کو مکمل طور پر ترک کرنے کا خود کو پابند بنایا ہے۔ شریعت میں معاہدات کو پورا کرنے کے واضح احکامات موجود ہیں، جیسے سورۃ المائدۃ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ﴾ [المائدۃ۵: ۱] (اے ایمان والو! عہد پورے کیا کرو)۔

اسی طرح ایک اور آیت کریمہ میں بھی عہدوں کی پاسداری کا حکم دیا گیا: ﴿وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللهِ إِذَا عَاهَدْتُمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلًا إِنَّ اللهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ﴾ [النحل۱۶: ۹۱] (اور جب تم آپس میں عہد کر چکے ہو، تو اللہ کے عہد کو پورا کرو اور پختہ قسمیں کھانے کے بعد انہیں نہ توڑو؛ حالانکہ تم اللہ کو اپنا ضامن مقرر کر چکے ہو)۔

پھر جنگ سے متعلق معاہدات کو پورا کرنے کی خاص طور پر سختی سے تاکید کی گئی ہے، جیسے رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: من كان بينه وبين قوم عهد، فلا يحلن عهدا ولا يشدنه، حتى يمضي أمده أو ينبذ إليهم على سواء[2] (جس آدمی کے اور کسی قوم کے درمیان عہد و پیمان ہو، تو جب تک اس کی مدت ختم نہ ہو جائے یا اس عہد کو ان تک برابری کے ساتھ واپس نہ کیا جائے، ہرگز عہد نہ توڑے اور نہ نیا عہد کرے)۔

1. Geneva Convention, Additional Protocol II, 1977, Article: 4(2)(f)

۲۔ سنن ترمذی، کتاب السیر، باب ماجاء فی الغدر، حدیث نمبر: ۱۵۸۰

اسی طرح ایک اور حدیث میں بھی معاہدات پر قائم رہنے کا حکم دیا گیا ہے: اَلْمُسْلِمُونَ عَلٰی شُرُوطِهِمْ[۱] (مسلمان اپنی شرطوں پر قائم رہیں گے)۔

آخری بات!

اسلام نے کبھی غلامی کو واجب قرار نہیں دیا، بلکہ ایک مباح عمل تھا، جو پہلے سے معاشرہ کا حصہ تھا۔ اب موجودہ دور میں مسلمان ممالک مذکورہ بالا معاہدات کا حصہ ہیں، جو غلامی کو ممنوع قرار دیتے ہیں، لہٰذا یہ مباح عمل اس وقت تک ممنوع رہے گا، جب تک مسلمان ممالک ان معاہدات کا حصہ ہیں اور ان کے لیے معاہدات کا حصہ ہونے تک جنگی قیدیوں کو غلام بنانا، شرعاً و قانوناً ناجائز ہو گا۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ اسلام نے غلامی کو مکمل طور پر حرام بھی قرار نہیں دیا، لہٰذا اگر کوئی مسلمان ملک موجودہ زمانے میں جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کا خواہاں ہے، تو اس پر لازم ہے کہ وہ غلامی کو ممنوع قرار دینے والے عالمی معاہدات سے علی الاعلان نکلے، لیکن اس صورت میں یہ بات مدنظر رہے کہ دوسروں کو غلام بنانے کا ارادہ رکھنے والے، پھر اس بات کے لیے بھی تیار رہیں کہ دوسرے بھی آپ کے جنگی قیدیوں کو غلام بنائیں گے، بالفاظ دیگر دوسروں کو غلام بنانے کی خواہش، مقابل فریق کو اپنے قیدیوں کو غلام بنانے کا موقع دینا ہے۔

نتائج

- غلامی کی ابتدا اسلام کے آنے سے بہت پہلے ہو چکی تھی، لہٰذا مسلمانوں یا اسلام اس معاملے میں مطعون کرنا ناانصافی ہو گی۔
- اسلام سے پہلے غلامی انتہائی ظالمانہ شکل میں ہر تہذیب و مذہب کا حصہ رہی ہے۔

۱۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاقضیۃ، باب فی الصلح، حدیث نمبر: ۳۵۹۴

- اسلام نے کبھی غلامی کو واجب قرار نہیں دیا، بلکہ ایک مباح عمل تھا، جو عالمی معاہدات پر دستخط کرنے کی وجہ سے اب ممنوع ہو چکا ہے۔
- اسلام نے غلاموں کو بہت سے حقوق دے کر معاشرہ میں برابر کے انسان کی حیثیت دی اور بنیادی حقوق تک رسائی ممکن بنائی۔
- شریعتِ اسلامی نے، سوائے جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کے، غلامی کے تمام مروجہ راستے بند کر دیے، جبکہ غلاموں کو آزاد کرنے کے تمام ممکنہ راستے کھول دیے۔
- اسلام نے چند اخلاقی، معاشی، نفسیاتی، سیاسی اور معاشرتی وجوہات کی بنا پر غلامی کو دیگر ناپسندیدہ امور کی طرح یکسر ختم نہیں کیا۔
- باندیوں سے تمتع اگرچہ شرعاً جائز ہے، لیکن انصاف کی نظر سے دیکھا جائے، تو اسلامی احکامات نے باندی کو معاشرتی اور جنسی تحفظ فراہم کیا اور اسے مشترکہ ملکیت سے نکال کر ان سے تمتع کو صورتاً نکاح کی طرح بنا دیا۔
- قدیم تہذیبوں اور اسلام کے تصورِ غلامی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ دوسری تہذیبوں نے اس کے خاتمہ کے لیے کوئی لائحہ عمل نہیں دیا، جب کہ اسلام نے وقتی طور اس کو برداشت کر کے، اس سے متعلق ایسے احکامات دیے کہ بتدریج یہ اپنے اختتام تک پہنچی۔
- موجودہ دور میں مسلمان ممالک چونکہ ان عالمی معاہدات کا حصہ ہیں، جن کی رو سے غلامی ممنوع ہے، لہٰذا غلام بنانا قانوناً و شرعاً جائز نہیں۔

جنسی تشدد اور پاکستانی قانون

عمران شفیق*

بین الاقوامی قانون، رواج اور معاہدات پر مبنی ہے اور اس کا دائرہ اختیار ریاستوں اور قوموں تک محدود ہے، لیکن اس کا ایک دائرہ عمل ایسا ہے جو اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر ہے اور وہ ہے بین الاقوامی فوجداری قانون جس کے دائرہ عمل میں افراد بھی آتے ہیں اس لیے کہ فوجداری مسئولیت اور فوجداری ذمہ داری کے بنیادی تصور میں یہ چیز شامل ہے کہ عمل کرنے والا ایک فرد ہوتا ہے۔ جنسی تشدد کے جرائم میں اس بات کا تصور بھی محال ہے کہ وہ کسی فرد کے عمل کا نتیجہ نہ ہو۔ جنسی تشدد کو بین الاقوامی قانون دو زمروں میں شامل کرتا ہے۔ ایک انسانیت کے خلاف جرائم اور دوسرا جنگی جرائم۔ معاہدہ روم جو بین الاقوامی فوجداری عدالت کا قانون ہے، اس کی دفعہ ۷ انسانیت کے خلاف جرائم سے متعلق ہے اور دفعہ ۸ جنگی جرائم کو بیان کرتی ہے۔

جنسی جرائم جنگ کے دوران ہوں یا اس کے علاوہ کسی اور صورت حال میں، ان کے دو پہلو بہت اہمیت کے حامل ہیں، جن پر بین الاقوامی قانون حرکت میں آتا ہے اور جو اس کی بنیادی شرائط میں بھی شامل ہیں۔ دفعہ سات میں جو جنسی جرائم ہیں، اس کے لیے کچھ شرائط عائد کی گئی ہیں، جیسے وہ منظم انداز اور طریقہ کار کے تحت کیے گئے ہوں اور یہ ان کا ارتکاب وسیع پیمانے پر ہو۔ تو یہ بین الاقوامی فوجداری عدالت کے دائرہ کار کے تحت آتے ہیں۔ اگر یہ وہ عام شہریوں، کسی کمیونٹی یا کسی ملک کے خلاف ہوں اور منظم انداز میں کیے جارہے ہوں تو یہ انسانیت کے خلاف جرائم میں آتے ہیں۔ جنسی تشدد جس کو بین الاقوامی قانون تسلیم کرتا ہے، اس کی پانچ قسمیں ہیں: ان میں سے سب سے پہلی قسم زنا بالجبر ہے۔ دوسری جنسی غلامی، آپ کسی بھی فرد کو چاہے وہ بچہ ہو، بچی ہو، عورت ہو یا مرد ہو، قطع نظر اس کی جنس کے اسے جنسی غلامی کے لیے استعمال نہیں کر

* ایڈووکیٹ (ہائی کورٹ)، اسلام آباد

سکتے۔ اس کی تیسری قسم جبری طور پر جسم فروشی ہے جو جنسی غلامی سے ملتی جلتی ہے کہ کوئی جبری طور پر کسی کو جسم فروشی کے دھندے پر ایک منظم انداز میں لگا دیں۔ اس کے بعد جبری حمل ہے۔ اس کا بھی ایک عنصر یہ ہے کہ کوئی اپنے آپ کو بنیادی طور پر برتر سمجھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ دوسری نسل کی خواتین اس نسل کے بچے پیدا کریں۔ بلکہ ایک مہم کے تحت وہ اپنی نسل کے بچے پیدا کرنے کے لیے ان کو مجبور کریں۔ اس کو بھی اسی کٹیگری میں شامل کیا گیا ہے۔ اسی مقصد کی ایک اور شکل forced realization ہے۔ یعنی کوئی یہ چاہتا ہو کہ ان کے مرد اپنی نسل کو جاری ہی نہ رکھ سکیں۔ یہ تمام کے تمام جرائم جنسی تشدد کی تعریف میں شامل ہیں۔

بین الاقوامی قانون تب حرکت میں آئے گا اور افراد کو سزا اس وقت دے گا جب کم از کم یہ دو شرائط پوری ہوں گی۔ ان کے علاوہ دیگر شرائط بھی موجود ہیں۔ لیکن ان دو بنیادی شرائط کا پورا ہونا لازمی ہے، کہ ایک تو یہ وسیع پیمانے پر ہوں اور دوسرا یہ کسی خاص نسل کے خلاف ہوں۔ دفعہ ۸ بھی اسی طرح کی ہے۔ وہ ان تمام جرائم کو اسی طرح جنگی جرائم میں شامل کرتا ہے، جب وہ کسی جنگ کے دوران یا کسی تصادم کے دوران کیے جا رہے ہوں۔ جرم کے سرزد ہونے کے لیے وہ جس چیز کو ضروری قرار دیتا ہے، وہ یہ ہے کہ جرم کا ارتکاب باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ بڑے پیمانے پر کیا جائے۔ اگر اس نیت کے تحت آپ اس کو لے کر آئیں گے تو پھر یہ اس کے سیکشن ۸ کی ذیلی دفعہ ۲۲ کے تحت ریپ کی تعریف اور دوسری چیزوں میں وہ داخل ہو سکے گا۔ یہ ایک اس کا پہلو ہے جو قانون میں آپ کو جنسی تشدد کی تعریف میں ملتا ہے اور اسی لیے اس کو جرم قرار دیتا ہے۔ کیونکہ بہت سے ممالک سزائے موت کو جائز نہیں سمجھتے اور عمر قید کی حد کو بھی وہ اسی یا سو سال تک لے جانے کے لیے تیار نہیں ہیں، اس کا درمیانی راستہ انہوں نے یہ نکالا ہے کہ ان مقدمات کے نتیجے میں ۳۰ سال کی سزائے قید تجویز کی گئی ہے، جس کو کسی ملک کی قومی عدالتیں دے سکتی ہیں۔ اس میں اختلاف یہ ہے کہ بین الاقوامی قانون میں آپ جب کسی کے خلاف مقدمہ چلاتے ہیں تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ آپ کو اختیار سماعت حاصل ہے یا نہیں اور اگر ہے تو وہ کس حد

تک حاصل ہے۔ بین الاقوامی قانون آج تک اپنے اختیار سماعت کے بارے میں بہت زیادہ واضح نہیں۔ چونکہ بین الاقوامی قانون رواجات کا نتیجہ ہے، جو رواجات وضع ہو چکے ہیں وہ ان ملکوں میں عرصہ دراز سے چلے آرہے ہیں۔

لیکن میرے اور آپ کے سامنے جب کوئی رواج آتا ہے تو وہ کسی مفکر کی کتاب سے آتا ہے، جو کافی سارے مواقع سے نتیجہ اخذ کرنے کے بعد یہ بتاتا ہے کہ یہ رواج ہے۔ پھر اس پر بحث ہوتی ہے کہ رواج میں کیا چیزیں شامل ہیں اور کیا نہیں ہیں۔ معاہدے کے ذریعے بھی آپ ان معاملات میں کسی کو دائرہ اختیار دے سکتے ہیں، لیکن ان سب میں مسئلہ یہ ہے کہ کوئی اس اصول پر چلتا ہے جس کو علاقائیت (territoriality) کہتے ہیں کہ جو جرم میرے ملک کی حدود میں ہوا ہے، چاہے وہ کسی نے بھی کیا ہو اس پر میرا دائرہ اختیار ہے۔ کوئی شہریت کے اصول کا قائل ہے۔ میرے ملک کے شہری نے دنیا میں کہیں بھی کوئی جرم کیا ہے اس پر ٹرائل کرنے کا حق مجھے ہے، پہلا اور فائق حق میرا ہے۔ تیسرا اصول بھی ہے جس پر بحث رہتی ہے، وہ ہے پیسو پرسنیلٹی پرنسپل، جو یہ ہے کہ میرے ملک کے شہری کے خلاف اگر کوئی جرم ہوا ہے، میرے ملک کے شہری کے خلاف اقدام ہوا ہے، وہ دنیا میں کہیں بھی ہوا ہے تو اس پر مجھے حق ہے کہ میں اس پر ایکشن لے سکوں۔ تاہم یہاں یہ فرق ملحوظ خاطر رہے کہ سبجیکٹو پرسنیلٹی پرنسپل یہ ہے کہ میرے ملک کے شہری نے کوئی اقدام کیا، لیکن پیسو پرسنیلٹی اصول یہ ہے کہ میرے ملک کے شہری کے خلاف اقدام ہوا تو یہ دونوں اصول مختلف ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور پرنسپل پری ایمپٹو یا پروٹیکٹو جیورسڈکشن کا ہے۔ آپ نے سنا ہو گا کہ بعض دفعہ یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ مجھے فلاں سے خطرہ تھا، اس لیے ہم نے اس کے خلاف پیش بندی کے طور پر اقدام کیا ہے اور اس اختیار کو بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔

اب آفاقی دائرہ اختیار کا ایک نیا اصول بن رہا ہے کہ جرم کہیں بھی ہوا ہے، کسی نے بھی کیا ہے، لیکن اگر کہیں نہ کہیں آپ کے ملک کا ربط اس کے ساتھ ہے یا جو بین الاقوامی عدالتیں ہیں ان کا ہے تو وہ آفاقی دائرہ اختیار کے اصول کو اختیار کر سکتی ہیں۔ لیکن چونکہ ہماری بحث اسلامی تناظر

میں ہو رہی اور اس پر بہت کم بات کی گئی ہے تو میں اس میں صرف ایک آدھ بات ذکر کر کے باقی علما پر چھوڑ دوں گا، کیونکہ وہ اس موضوع پر بہتر طریقے سے بحث کر سکتے ہیں۔

ہمارا قانون چودہ سو سال سے جس اصول کو لے کر چل رہا ہے۔ وہ ان تمام اصولوں سے سے زیادہ مناسب اور ان سے زیادہ عالمی سطح پر تسلیم کیے جانے کے قابل ہے۔ اور مسلمانوں میں بھی اس اصول کے حوالے سے تقریباً اتفاق رہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست کا شہری کہیں بھی کسی بھی جگہ کوئی جرم کرے گا تو اسلامی ریاست کو، امام کو یہ اختیار حاصل ہو گا کہ اس پر اپنی سزائیں اور حدود نافذ کر سکے۔ البتہ حنفیہ اور جمہور کے درمیان یہ اختلاف ضرور رہا ہے کہ آیا یہ سزا دارالحرب میں دی جائے گی یا اس بات کا انتظار کیا جائے گا کہ مجرم پر سزا اس وقت نافذ کی جائے جب وہ دارالاسلام میں واپس آجائے۔ نفاذ کے وقت پر اختلاف ضرور ہے، لیکن جرم ہونے اور اس کی سزا پر اسلامی قانون میں چودہ صدیوں سے کوئی اختلاف نہیں۔ بلکہ اسلامی قانون کی خوبصورتی یہ ہے کہ آپ کو اس بارے میں قرآن سے آیات ملیں گی جن میں اصول بیان کیے گئے ہیں، لیکن اس بارے میں جو واضح تعلیمات ہیں وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ میں اپنے اسوہ مبارکہ کے ذریعے اور اپنے ارشادات کے ذریعے اسلام کے قانون جنگ کو وضع فرمایا ہے۔

جملہ معترضہ کے طور پر یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ جو لوگ صرف قرآن مجید کو شریعت کا ماخذ سمجھتے ہیں اور لبرل بنتے ہیں اور جدیدیت کا پرچار کرتے ہیں۔ ان سے پوچھا جائے کہ اگر سِیَر سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس کو نکال دیا جائے تو اسلامی قانون جنگ یا فقہ السیر بالکل ختم ہو جاتی ہے اور اپنی بنیادیں کھو دیتی ہے۔ چودہ سو سال سے یہ جو قانون چلا آرہا ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ اور آپ کے ارشادات کی روشنی میں بنا ہے۔ بین الاقوامی قانون اس میں ایک اور چیز کا اضافہ کرتا ہے کہ وہ ریاستوں کو پہلا حق دیتا ہے کہ وہ ان جرائم کے مرتکب

افراد پر مقدمہ چلائیں اور اس کے نتیجے میں ان کو سزائیں سنا کر ان کا نفاذ بھی کریں۔ اس حوالے سے بنیادی ذمہ داری ریاستوں کی ہے۔

میں پاکستان کے قانون کا جائزہ لے رہا تھا تو میں نے جب بہت سے ممالک کے قوانین کو اس حوالے سے دیکھا تو پاکستان کا قانون بین الاقوامی قانون کے تمام معیارات پر پورا اترتا ہے۔ حتیٰ کہ پاکستانی قانون میں جو سزائیں ہیں یقیناً حدود آرڈیننس میں کچھ ترامیم ضرور کی گئی ہیں، لیکن جو جنسی تشدد کے جرائم ہیں ان پر سزائیں موجود ہیں۔ ہمارے ہاں بدقسمتی سے حدود آرڈیننس پر ایک بحث یہ شروع ہو گئی کہ ایک ہے رضامندی کے ساتھ جنسی تعلق اور ایک ہے زبردستی یا بغیر رضامندی کے جنسی تعلق۔ اب جو پہلی قسم ہے اس پر ہمارے ہاں تحفظ نسواں کے تحت بہت سی تبدیلیاں لائی گئی ہیں، لیکن جو ریپ اور جبری زنا ہے، جس کو جنگی جرائم میں یا انسانیت کے خلاف جرائم میں لایا گیا ہے۔ اس میں ہمارا قانون بالکل واضح ہے اور اس کی سزا موت ہے یا عمر قید ہے۔ ہمارا قانون اس کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیتا ہے جس کا تعلق عورت کی تکریم کے ساتھ ہے۔ اس کو غلط نظر سے دیکھنے سے لے کر اس کو غلط میسج کرنے پر اور آخری اقدام تک ہر چیز کو قانون میں سمویا گیا ہے۔

۲۰۲۱ء کا اینٹی ریپ قانون اور انویسٹی گیشن اینڈ پراسیکیوشن ایکٹ ایک سخت قانون ہے۔ بہت سے عام کیسوں میں چھوٹ ہوتی ہے، لیکن ان کیسوں کے لیے خصوصی عدالتیں بنا دی گئی ہیں، زینب الرٹ قانون ہے، جس میں بچیوں کے اوپر جو ریپ کے اقدامات تھے، انتہائی سخت قانون ہے۔ خصوصی عدالتیں ہیں، مہینے دو مہینے کے اندر سزا دیتی ہیں۔ prevention of trafficking of person act ہے، ۲۰۱۸ کا prevention of electronic crime act ہے۔ اس کی دفعہ ۲۲ اور ۲۳ ایس کو آپ پڑھ لیں جس سے پتا چلتا ہے کہ تھوڑا سا بھی آپ کو کہیں ڈی گریڈیشن نظر آئے گا اس پر پکڑ ہو گی۔ ابھی پچھلے دنوں کام کرنے کی جگہوں پر خواتین کے ساتھ ہراسگی کے متعلق قانون آیا ہے۔ اب اگر آپ کسی خاتون کو کام کی جگہ پر صبح

صبح السلام علیکم بھی کہیں گے یا گڈ مارننگ کا میسج بھیجیں گے، وہ بھی اس قانون کے تحت ہراسمنٹ کے زمرے میں آتا ہے۔ پاکستان ان قوانین میں خود کفیل ہے اور ہمیں مزید کسی قانون کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ موجودہ قوانین پر عمل درآمد کی ضرورت ہے۔

ایک چیز کا اضافہ کرتا چلوں کہ جنگ کے دوران عام طور پر جرائم فوج کے باثر افراد کے زیر اثر ہوتے ہیں۔ پاکستان کا قانون اس مشکل کا بھی حل فراہم کرتا ہے۔ پاکستان آرمی ایکٹ، پاکستان ایئر فورس ایکٹ، پاکستان نیوی ایکٹ ان تمام میں ایک دفعہ ہے، آرمی ایکٹ میں وہ دفعہ ۶۹ ہے۔ کوئی بھی فوجی افسر کوئی بھی کمیشنڈ آفیسر اگر کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے، جس کو civil offence گردانا جاتا ہے۔ یعنی جو مجموعہ تعزیرات پاکستان یا کسی اور فوجداری قانون میں شامل ہے تو اس کو سزا دی جائے گی، البتہ اس کا طریقہ کار اور عدالت مختلف ہوتی ہے، یعنی فیلڈ جنرل کورٹ مارشل۔

مجموعہ تعزیرات پاکستان کے متعلق میں یہ بھی بتا دوں کہ اس کی جیورسڈکشن بھی بڑی زبردست ہے اور اس کا دائرہ کار بہت وسیع ہے۔ ایک غیر ملکی شہری کے جو پاکستان سے باہر ہو کے علاوہ ہر فرد اس کے دائرہ کار میں آتا ہے۔ چنانچہ پاکستان کا شہری، یا کوئی غیر ملکی شہری پاکستان کے اندر یا کسی پاکستانی شہری کے ساتھ کوئی جرم کرے تو اس پر تعزیرات پاکستان کا اطلاق ہوتا ہے اور پاکستانی عدالتوں اور اداروں کو اس کے خلاف ایکشن لینے کا مکمل حق حاصل ہے۔ اور سب سے بڑھ کر جو جیورسڈکشن ہے جس کو کلبھوشن یادیو کیس میں بھی سراہا گیا ہے، وقار سیٹھ صاحب کا فیصلہ ان دنوں بہت مشہور ہوا تھا۔ پاکستان میں آئین کے آرٹیکل ۱۹۹ کے تحت ہائی کورٹ کی جیورس ڈکشن ہے۔ ہائی کورٹ کے دائرہ اختیار اور آئین پاکستان کے آرٹیکل چار کے تحت پاکستان کا قانون انسانوں کی عزت کی بات کرتا ہے، ان کے بنیادی حقوق کی بات کرتا ہے۔ زندہ رہنے کا حق، عزت اور آزادی جو کہ پاکستان میں پاکستان کے شہری کو میسر ہے، اسی طرح ہر اس شخص کو جو پاکستان کی سرزمین میں آگیا یا اس کے کسی جہاز میں آگیا، پاکستان کے کسی فارمشن میں آگیا۔ یا کسی بھی طرح

وہ پاکستان کی امان میں داخل ہو گیا، وہ ہمارے لیے اتنا ہی محترم ہے جتنا پاکستان کا عام شہری ہے۔ اگر اس کے خلاف کسی جرم کا ارتکاب ہوا یا وہ کسی جرم کا ارتکاب کرے گا تو پاکستان کا قانون اس پر حرکت میں آسکتا ہے۔ یا اگر ایسے حالات ہیں جن میں کوئی بھی آپ کے خلاف کیے گئے جرائم پر ایکشن نہیں لے رہا تو آپ آئین کے آرٹیکل ۱۹۹ کے تحت ہائی کورٹ میں رٹ دائر کر سکتے ہیں۔ پاکستان کی عدالتیں پوری طرح مجاز ہیں کہ وہ رٹ جاری کریں پاکستان کے تمام اداروں کو، انتظامیہ کو، سرکاری مشینری کو، بلکہ اعلیٰ عدلیہ نے پارلیمنٹ کو قانون سازی کی ہدایات بھی جاری کی ہیں۔ اسی طرح عدالت ایف آئی آر کے اندراج کا حکم بھی دے سکتی ہے۔

اپنی بات کے اختتام پر ایک چیز یہاں اور بیان کرنا چاہوں گا کہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی جس کا میں طالب علم رہا ہوں، یہاں ہم نے بین الاقوامی قانون پڑھا۔ لیکن اسلام کا جو بین الاقوامی قانون ہے، فقہ السیر ہے۔ اس کو تقابل کے انداز میں پڑھانا کہ ہمیں یہ اندازہ ہو سکے کہ مغربی قانون جن چیزوں پر آج تک کشمکش اور نزاعات کا شکار ہے، وہ اسلامی قانون نے بہت عرصہ پہلے واضح ہو چکی ہیں۔ اس میدان میں ڈاکٹر محمود احمد غازی نے بہت کام کیا ہے، ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے بہت کام کیا ہے۔ مولانا مودودی کا الجہاد فی الاسلام کی صورت میں بہت اچھا لٹریچر موجود ہے۔ لیکن اگر وہ صرف لائبریریوں میں موجود ہے اور ہمارے طلبہ اس حقیقت سے آشکار نہیں ہو رہے اور ان کو اس انداز سے نہیں پڑھایا جا رہا تو اس کمزوری کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ سب خواتین و حضرات کا بہت شکریہ۔

سوال و جواب

ڈاکٹر ضیاء اللہ رحمانی: عمران شفیق ایڈووکیٹ صاحب نے جنسی تشدد کے حوالے سے پاکستانی قانون کے اہم نکات بڑی جامعیت سے بیان کیے اور بتایا کہ خواتین کو اس حوالے سے کیا قانونی تحفظ حاصل ہے؛ تاہم اس حوالے سے میرا سوال یہ ہے کہ بعض اوقات مردوں کو بھی جنسی ہراسانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، تو کیا پاکستانی قانون میں ان کو کوئی تحفظ فراہم کیا گیا ہے؟ میں یہاں

ایک وضاحت کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں؛ کیونکہ میں آئی سی آر سی کی نمائندگی کر رہا ہوں۔ بین الاقوامی قانون کے حوالے سے یہ بات کہی گئی کہ یہ بہت کمزور قانون ہے اور نفاذ کے حوالے سے اس کو مسئلہ درپیش ہے۔ اسی طرح بین الاقوامی فوجداری عدالت کی بات ہوئی جو روم کے قانون کے تحت بنائی گئی ہے۔ اس میں بہت سے قابل تعریف اقدامات شامل ہیں۔ لیکن دنیا کے کئی طاقتور ممالک نے اس قانون پر دستخط ہی نہیں کیے۔ اور اس کے رکن ہی نہیں، اس لیے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ آپ ان کے کسی شہری کے خلاف کوئی قانونی چارہ جوئی اس قانون کے تحت کر سکیں۔

بین الاقوامی قانون کی اس کمزوری کا آئی سی آر سی کو بہت اچھی طرح سے ادراک ہے، اس لیے آئی سی آر سی کی کوشش ہوتی ہے کہ قانون انسانیت کے حوالے سے جتنے بھی بین الاقوامی معاہدات ہیں ان کی قومی سطح پر تنفیذ ہو۔ آئی سی آر سی نے ہر ملک میں یہ کوشش کی ہے کہ وہ اس ملک کی پارلیمنٹ میں ایک کمیٹی بنوائے جو ان معاہدات کو اپنی قومی قانون سازی میں شامل کریں۔ ایک اور بات یہ کہ بعض ممالک جس طرح عمر قید یا سزائے موت کو تسلیم نہیں کرتے تو اس حوالے سے آئی سی آر سی کی کوشش یہ ہے کہ اس جرم کی جو بھی سزا کوئی ملک دینا چاہے وہ دے، لیکن اس جرم کو قانون کے دائرے میں ضرور لائے۔

عمران شفیق ایڈووکیٹ: مردوں کو درپیش جنسی ہراسانی کے بارے میں اتنی سی بات کہوں گا کہ ہمارے قانون میں اس حوالے سے مجموعہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۳۷۷ میں ایک خاص صورت کو قابل تعزیر قرار دیا گیا ہے، البتہ اس سے کم تر کسی بھی اقدام کو ہراسانی تسلیم نہیں کیا گیا۔

مسلح تصادم اور داخلی خلفشار کے دوران جنسی تشدد:
اسلامی اور تاریخی تناظر

سید معاذ شاہ*

مقدمہ

انسانی تاریخ کا اگر ابتدا سے جائزہ لیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ یہ بابلیون تھے جنہوں نے انسان کے لیے پہلے تحریری قوانین وضع کیے۔ عظیم بادشاہ حمورابی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے قرار دیا: "میں نے یہ قوانین اس لیے وضع کیے ہیں تا کہ طاقتور کمزور کو نہ دبا سکے۔"[1] اس زمانے میں بھی جنگ سے متعلق انسان کے وضع کردہ کچھ ابتدائی قوانین ضرور موجود تھے جن میں وقت کے ساتھ ساتھ ارتقا ہوتا رہا۔

قدیم مصری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قانون میں یہ ارتقا انسانی بنیادوں پر ہر گز نہیں ہوا ، جیسا کہ پورے کے پورے شہر مزاحمت کرنے کی وجہ سے تہہ تیغ کر دیے گئے۔ یہ تو جنگ میں بے زاری کی حد تک تھکاوٹ تھی جو امن قائم کرنے کا سبب بنی۔ اس حوالے سے پہلا تحریری امن معاہدہ وہ تھا جو مصریوں نے فرعون دوم کی قیادت میں ہٹیز (Hitttites) کے متولی دوم (Mutawalli II) کے ساتھ کیا جو کہ معاہدۂ کادیش[2] کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدے میں کئی دلچسپ نکات شامل تھے جیسا کہ "رینک افسران اور اہم افراد کو ان کے حکمرانوں کو لوٹا دیا جائے گا، اگر وہ کسی جرم کی سزا سے بچنے کی خاطر ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں فرار

---

* ڈائریکٹر مرکز برائے انسانی حقوق، ضیاء الدین یونیورسٹی کراچی۔ اس مقالے کی تیاری میں بشریٰ سیال، طالبہ سال چہارم ایل ایل بی، ضیاء الدین یونیورسٹی نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

1. The Code of Hammurabi.
2. Mark, Joshua J., *World History Encyclopedia*. https://www.worldhistory.org/Kadesh/, 2009.

ہو جاتے ہیں۔"[1] یہ علامتی طور پر سہی اس پیش رفت کی طرف اشارہ کرتا ہے جو بین الاقوامی سطح پر بھگوڑوں کو واپس کرنے کے حوالے سے ہوئی۔ اسلامی روایات میں بھی ہمیں اس سے ملتی جلتی پیش رفت ملتی ہے۔

مشہور یونانی مورخ ہیروڈوٹس (Herodotus)، جسے تاریخ کے بانی کے طور جانا جاتا ہے، نے کیمبیسس (Cambyses) کے مصر پر حملے اور اہلِ میمفس (Memphis) سے بدلہ لینے کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے یہ اقدام اہل مصر کی جانب سے دھوکہ دینے کے بعد اٹھایا، جس کے نتیجے میں مصر کے عظیم شہر میمفس کو ہر مارے جانے والے ایرانی کے بدلے میں ۱۰ آدمیوں کی قیمت ادا کرنی پڑی اور ان کے پکڑے جانے والے ۲۰۰۰ آدمیوں کو قتل کر دیا گیا۔ ہیروڈوٹس لکھتا ہے: کیمبیسس نے انتقام میں نہ صرف اماسس فرعون جو ایرانی حملے سے پہلے مر گیا تھا کی قبر کھول کر ایرانی روایت سے انحراف کرتے ہوئے انتہائی غیر انسانی حرکت کی، بلکہ اس کی بے حرمتی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، جیسا کہ کوڑوں سے مارنا، اس کے بال نوچنا اور آخر کار لاش کو جلانا۔[2]

ایشیاٹک ویسپرز (Asiatic Vespers) کا مشہور قتلِ عام تاریخ میں پہلا قتلِ عام ہے جہاں پونٹس کے حکمران (Mithridates VI Eupator) نے ایشیا میں زمینوں کے حصول اور اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے کی خاطر پہلے سفارتی طور پر ناکام کوشش کی۔ پھر اس نے تمام لاطینی بولنے والے رومیوں کا قتلِ عام کرنے کے لیے ایشیائے کوچک کے مقامی لوگوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کیا اور اس وقت ایک اندازے کے مطابق منظم قتلِ عام کے تحت تقریباً ۸۰،۰۰۰ سے ۱۵۰،۰۰۰ رومی مارے گئے تھے۔ اپین (Appain) لکھتا ہے: "پورے ایشیا میں رومیوں اور

1. Bunson, M., *The Encyclopedia of Ancient Egypt.* Gramercy Books, 1991. Pg. 87.
2. Herodotus (Trans. Robin Waterfield, Carolyn Dewald), OUP (1998)., *The Histories*, Book III, Chapter 16.

اطالویوں جن میں مرد، عورتیں، بچے، آزاد اور غلام جو اطالوی النسل تھے سب کو ہولناک انجام کا سامنا کرنا پڑا۔"[1]

فارس کے بادشاہ خسرو پرویز نے جب روم کے خلاف اعلان جنگ کیا تو اس نے اپنی سلطنت کے تمام مسیحی گرجاگھروں اور عبادت گاہوں کو لوٹ لیا اور انہیں زمین بوس کر دیا جن میں سینٹ ہیلینا اور قسطنطنیہ کے عظیم گرجاگھر شامل تھے، اور اسی طرح صلیب کے پرستاروں کو آگ کی عبادت پر مجبور کیا۔ ایک اندازے کے مطابق اس نے ۹۰،۰۰۰ عیسائیوں کا قتل عام کیا اور اس وقت کے پوپ زچریاس (Zacharias) کو قیدی بنالیا۔[2] اس کے جواب میں رومیوں نے بھی کوئی کسر نہ چھوڑی، جب رومی شہنشاہ ہرکولیس نے شمال کی جانب سے فارس پر حملہ کیا تو اس نے یورینا قصبے میں آتش پرستوں کے تمام مقدس مقامات کو مسمار کر دیا اور ان کے مذہب کو نیچا دکھانے کی ہر ممکنہ کوشش کی۔[3] یہ حملہ صرف فارس کے خلاف نہیں تھا، بلکہ رومیوں نے ان کی پوری نسل کو ختم کر دیا۔

اسی طرح قیصر روم جسٹنین (Jastinian) نے جب وینڈلز کی طرف پیش قدمی کی تو ان کو صفحہ ہستی سے ہی مٹا دیا۔ جنگ سے پہلے وینڈلز کے پاس ۱۲۰،۰۰۰ قابل آدمی تھے۔ عورتوں، بچوں اور غلاموں کی ایک بڑی تعداد ان کے علاوہ تھی۔ رومیوں نے جب ان پر تسلط حاصل کیا تو ایک بھی قابل آدمی باقی نہ رہا۔ گبن کہتا ہے کہ تقریباً پوری قوم مکمل طور پر ختم کر دی گی۔[4]

ایک اور اہم واقعہ شاہپور ذوالکتف (Shahpoor Zulakatf) کا ہے جو ۳۳۹ عیسوی میں فارس کا حکمران تھا۔ اس نے بشپ مارشیمون اور ۱۰۵ دیگر پادریوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا

1 Appian of Alexandria, (Trans. Horace White), *The Mithridatic Wars*, pg. 5.
2. Gibbon, Edwards, *Decline & Fall of the Roman Empire*, Vol. 5, Para XLVI.
3. *Ibid.* Vol. 1, Chapter XLVI.
4. *Ibid*. Vol. 5, Chapter XLIII.

اور بہت سے گرجا گھروں اور عبادت گاہوں کو لوٹ لیا تھا۔ اس کے نتیجے میں عیسائیوں کو اگلے ۴۰ سال ایرانیوں کا جبر و ستم سہنا پڑا۔[1]

قدیم کلیسا نے عیسائیوں کے سپاہی بننے اور جنگ میں شریک ہونے پر پابندی عائد کر رکھی تھی جو بالآخر روم میں حکمران طبقے کی تبدیلی کے ساتھ ختم ہوگئی۔ ہپو کے آگسٹائن، جو سینٹ آگسٹائن کے نام سے معروف ہے، کو "عادلانہ جنگ" کا استثنا پیدا کرنے والا پہلا شخص قرار دیا جاتا ہے۔ سینٹ آگسٹائن نے قرار دیا: "جنہوں نے حکمِ الٰہی کی تعمیل میں، یا اس کے قوانین کے مطابق جنگ لڑی ہے، تو انہوں نے عوامی انصاف یا فلسفۂ حکمرانی کی نمائندگی کی ہے، اور اس حیثیت میں بدکاروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ ایسے لوگوں نے کسی بھی طرح سے اس حکم کی خلاف ورزی نہیں کی ہے کہ تم قتل نہ کرو۔[2]

رد عمل میں اہل روم نے کلیسا اور یورپ کے حکمرانوں کو متاثر کیا جس کے نتیجے میں جنگی آداب کا ایک ضابطہ تیار ہوا۔ یہ ضابطے، اصول اور ہدایات سولہویں صدی عیسوی کے بعد ایک نظریے کی شکل اختیار کر گئے جو عادلانہ جنگ (bellum justim) کا نظریہ کہلاتا ہے۔ علمی روایت میں اسے بالعموم "قانون کے مطابق جنگ" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس کے مزید دو ذیلی حصے ہیں: یعنی: علت القتال (jus ad bellum)، وہ اصول جن کے ذریعے جنگ کے قانونی یا غیر قانونی ہونے کا تعین کیا جاتا ہے اور آداب القتال (jus in bello)، یعنی جو جنگ لڑنے کے طریقہ کار اور دشمن کے ساتھ برتاؤ کی وضاحت کرتا ہے۔[3]

جنگ کے جدید اصولوں کی عمارت انہی بنیادوں پر کھڑی ہے جو اب جنیوا معاہدات کے تحت مرتب ہو چکے ہیں۔ اسلام میں قانونِ جنگ کے اصول بالخصوص جو جنسی تشدد اور تشدد کی دیگر اقسام سے متعلق ہیں ان کی جڑیں قبل از اسلام کے دور سے ملتی ہیں۔

1. Sykes, Percy M., *History of Persia*, Vol. 1 (1915), pg. 448.
2. St. Augustine's *City of God*, pg. 426.
3. Landau-Tasseron, Ella, *"Non-Combatants" in Muslim Legal Thought*, Hudson Institute (2006), pg. 1.

قبل از اسلام رواجات

چونکہ زیادہ تر تاریخی واقعات اسلامی تناظر میں ذکر کیے گئے ہیں، ماضی کی روایتی تقسیم کو دو حصوں میں بیان کیا گیا ہے: قبل از اسلام اور اسلام۔ اگرچہ اس مقالے میں تنازعات کے دوران زمانہ جاہلیت کے رواجات پر خصوصی توجہ نہیں دی گئی ہے؛ تاہم یہ سمجھنے کے لیے اسلامی نقطہ نظر کی تشکیل کیسے ہوئی ان کی اپنی خاص اہمیت ہے۔ اس لیے کہ اسلامی قانون سے مراد وہ قرآنی احکام ہیں جن کی بعد میں آنے والی نسلوں نے تشریح کی ہے اور اس میں "عربوں کا روایتی قانون" بھی شامل ہے۔[1]

زمانہ جاہلیت کے حوالے سے ہمیں زیادہ تر معلومات نظموں میں ملتی ہیں۔ عرب فصیح اللسان لوگ تھے جن کے ہاں اظہار خیال کے لیے شاعری کی ایک مضبوط روایت پائی جاتی تھی۔ ان کی شاعری میں جہاں غم اور نقصان کا نوحہ ہے، تو وہیں عظیم کارناموں کو یادگار بنانے کی کوشش بھی نظر آتی ہے۔ چنانچہ قبل از اسلام عرب شاعری کا ذخیرہ جنگ کے طریقہ کار کی تفصیلات سے بھرا پڑا ہے۔

خواتین اکثر تنازعات اور جنسی تشدد کا نشانہ بنتی تھیں، ایک شاعر لکھتا ہے:

وعقيلة يسعى عليها قيم متغطرس أبديت عن خلخالها[2]

(بہت سی شریف عورتیں جن کے غیرت مند شوہر ان کی حفاظت میں پوری کوشش کرتے ہیں، ان کے پازیب میں نے کھول دیے)۔

ایک اور شاعر لکھتا ہے:

1. Pearl David and Werner Menski. *Muslim Family Law*. 3rd Edition. London (1998): Sweet & Maxwell.

۲۔ ابوالاعلیٰ مودودی، الجہاد فی الاسلام، (لاہور: ادارہ ترجمان القرآن، ۱۹۹۶ء) ص ۱۹۸

فالهم بيضات الخدو ر هناك لا النعم المراح[۱]

(اس وقت اصل مقصود گوری گوری پردہ نشین عورتیں ہوتی ہیں، نہ کہ چراگاہ سے واپس ہونے والے اونٹ)۔

عمرو بن کلثوم جنگ میں بے جگری سے لڑنے کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ اس کے قبیلے کو اپنی عورتوں کو بے حرمت ہونے کا کھٹکا لگا ہوا ہے۔

على آثارنا بيض حسان نحاذر أن تقسم أو تهونا[۲]

(ہمارے پیچھے گوری گوری خوبصورت عورتیں ہیں، ہمیں خوف ہے کہ کہیں وہ تقسیم یا ذلیل کی جائیں)۔

عورتوں پر تشدد اس قدر تھا کہ حاملہ عورتوں کے قتل کو فخر کے طور پر جتلایا جاتا۔ عامر بن طفیل جنگ فیف الریح میں اپنے قبیلے کی فتح بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

بَقَرْنَا الحَبالى من شَنُوءةَ بَعْدَما خَبَطنَا بفَيفِ الرّيحِ نَهْدًا وخثعَما[۳]

(ہم نے قبیلہ شنوءہ کی حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر ڈالے، اس سے قبل ہم فیف الریح میں قبیلہ نہد اور قبیلہ خثعم پر بھی کاری ضرب لگا چکے تھے)۔

مخالف عقیدے کے مذہبی پیشواوں اور عورتوں، جنہیں بالعموم غیر جنگجو تصور کیا جاتا ہے، کے قتل بہت زیادہ شواہد ملتے ہیں۔ اس کی ایک مثال چھٹی صدی میں قباد کے دور کی ہے، جب ایرانی حکمران کی ایما پر حیرہ کے بادشاہ منذر نے شام پر حملہ کیا اور اس نے ۴۰۰ پادریوں کو پکڑ کر اپنے دیوتا عزی کی قربان گاہ پر چڑھا دیا۔[۴]

۱۔ ایضاً

۲۔ ایضاً، ص۱۹۹

۳۔ ایضاً

4. Sykes, Percy M., *History of Persia*, Vol. 1 (1915), pg. 482.

ایک اور بدنام زمانہ واقعہ یمن کے یہودی حمیری بادشاہ ذونواس کا ہے جب اس نے ان تمام لوگوں کو پکڑ کر آگ میں جھونک دیا جنہوں نے اس کا مذہب ماننے سے انکار کر دیا ۔ عربوں کے ساتھ یہ سلوک ان کی ردّ عمل پر مبنی سیاست کی وجہ سے کیا گیا جو اکثر رومیوں اور ایرانیوں کے درمیان معلق رہتے تھے، اور ان کی پر اکسی جنگوں کا مرکز تھے۔

سزا اور جنگ میں آگ کے بطور آلہ استعمال کا بھی حوالہ ملتا ہے۔ منذر بن امرئ القیس نے جنگ اُوارہ میں جب قبیلہ بنی شیبان کو شکست دی تو ان کی عورتوں کو آگ میں زندہ جلانا شروع کر دیا۔ اس پر بنی قیس کے ایک شخص نے بمشکل ان کی جان بخشی کروائی۔ اعشی اسی واقعہ پر فخر کرتے ہوئے کہتا ہے:

سَبَايَا بني شيبانَ يومَ أُوَارَةٍ على النَّارِ إذْ تُجْلَى لهُ فَتَيَاتُها[1]

(اس نے جنگ اوارہ میں بنی شیبان کے قیدیوں کو چھڑا لیا، جبکہ ان کی جوان لڑکیاں آگ میں ڈالی جا رہی تھیں)۔

ایک اور واقعہ عمرو بن منذر کا ہے جس نے نذر مانی تھی کہ قبیلہ بنی دارم کے سو آدمیوں کو زندہ جلا ڈالوں گا۔ چنانچہ اس نے اس خاطر ان پر چڑھائی کی اور ۹۹ آدمی اس کے ہاتھ لگے جن کو اس نے زندہ جلا ڈالا۔ اتفاق سے اس وقت قبیلہ براجم کا ایک شخص ادھر سے گزر رہا تھا، عمرو نے اپنی منت پوری کرنے کے لیے اس کو بھی آگ کے الاؤ میں جھونک دیا۔ اس واقعہ کے متعلق جریر کہتا ہے:

أين الذين بنار عمرو أحرقوا أم أين أسعد فيكم المسترضع[2]

(کہاں ہیں وہ جو عمرو کی آگ میں جلائے گئے، اور کہاں ہے اسعد جو تمہارے درمیان پرورش پاتا تھا)۔

۱۔ ایضاً

۲۔ ایضاً، ص ۲۰۰

ہتھیار ڈالنا اس چیز کی ضمانت نہیں تھا کہ جان و مال کی امان حاصل ہو جائے گی۔ جنگی قیدیوں پر اکثر اوقات تشدد کیا جاتا تھا۔ جنگِ اُوارہ کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ القیس نے تمام جنگی قیدیوں کو کوہ اُوارہ کی چوٹی پر جمع کیا اور اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ انہیں پیہم قتل کرتے جائیں یہاں تک کہ پہاڑ کے دامن تک خون پہنچ جائے۔ آخر کار جب اس نے تمام قیدیوں کو قتل کروادیا اور خون ابھی تک پہاڑ کے دامن تک نہ پہنچا تو اس نے اپنا عہد پورا کرنے کے لیے خون میں پانی ملا دیا۔ ایک اور واقعہ بنی اسد پر غارت گری کا ہے جس میں پکڑے جانے والے ہر قیدی کو قتل کر دیا گیا۔ سپاہیوں کو حکم تھا کہ انہیں تلواروں سے نہ ماریں، بلکہ ڈنڈوں سے مار مار کر ہلاک کریں۔

لاشوں کا مثلہ کرنا اور انہیں مسخ کرنا بھی کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی، جیسا کہ پیچھے ذکر ہو چکا ہے کہ لاشوں کی بے حرمتی کی جاتی تھی۔ جنگِ یحامیم میں جب بنی جدیلہ کا سردار اسبع بن عمرو مارا گیا تو مخالف بنی سنبس کے ایک شخص نے اس کے کان کاٹ کر اپنے جوتوں میں گانٹھ لیے۔ ابو سروہ سنبسی اسی پر فخر کرتے ہوئے کہتا ہے:

نخصف بالآذان منكم نعالنا[1]

(ہم تمہارے کانوں کا پیوند اپنی جوتی میں لگاتے ہیں)

ایک اور سنبسی شاعر بنی جدیلہ کو خطاب کر کے کہتا ہے:

فإن تبغضونا بغضة في صدوركم فإنا جدعنا منكم وشرينا[2]

(اگر تم اپنے سینوں میں ہمارے خلاف بغض رکھتے ہو تو بے جا نہیں ہے؛ کیونکہ ہم نے تمہارے ناک کان کاٹے ہیں اور تم کو پکڑ پکڑ کر بیچا ہے)۔

لاشوں کی بے حرمتی کو ایک اور شاعر نے یوں بیان کیا ہے:

۱۔ ایضاً، ص ۲۰۲

۲۔ ایضاً

وشدُّوا شدة أخرى فجرُّوا بأرجُل مثلهم ورَمَوْا جُوَينا[1]

(انہوں نے ایک دوسرا حملہ کیا اور اپنے حریف کی ٹانگیں پکڑ کر گھسیٹیں، اور جُوین کو تیر مارا)۔

یہی وحشیانہ سوچ جنگ احد میں نظر آتی ہے، جب ابوسفیان کی بیوی ہند نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ بن عبد المطلبؓ کا جگر چبانے کا عہد کیا۔ اسی جنگ کا ایک اور واقعہ حضرت عاصم بن ثابت سے متعلق ہے جنہوں نے جنگ بدر میں عقبہ کے ساتھ طلحہ کے دو بیٹوں کو قتل کیا تھا ان کی ماں جس کا نام سلافہ تھا، نے منت مانی تھی کہ عاصم کا سر ملے گا تو اس میں شراب پیوں گی۔

اس سے پتا چلتا ہے کہ جنگ میں قیدیوں کے ساتھ بدسلوکی، لاشوں کو مسخ کرنا، عورتوں کی آبروریزی جیسی کئی وحشیانہ شکلیں رائج تھیں۔ قبل از اسلام عرب صرف اس روایت کو جاری رکھے ہوئے تھا جو مختلف قبائل کو جزوی طور پر اپنی سرپرست ریاستوں یعنی روم اور فارس سے وراثت میں ملی تھی۔

اسلام میں جنگ کے عمومی اصول

اسلام کی آمد کے ساتھ ہی عربوں میں رائج زمانہ جاہلیت کے اصولوں کی بقا کو خطرہ لاحق ہو گیا۔ خواتین اور قیدیوں کے حقوق اور اسی طرح حقوق العباد کے جامع تصور نے نہ صرف عربوں کی حرکیات کو تبدیل کرنے کا کام کیا بلکہ بنیادی طور پر قائم جمود توڑ ڈالا۔ اس باب میں جنگ کے قوانین بھی مستثنیٰ نہ تھے۔ انسانی زندگی کے تحفظ پر قرآن مجید میں جابجا زور دیا گیا ہے: ﴿مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا﴾ [المائدۃ۵: ۳۲] (جو شخص کسی کو [ناحق] قتل کرے گا [یعنی] بغیر اس کے کہ جان

۱۔ ایضاً

کا بدلہ لیا جائے یا ملک میں خرابی کرنے کی سزا دی جائے اُس نے گویا تمام لوگوں کو قتل کیا اور جو اس کی زندگانی کا موجب ہوا تو گویا تمام لوگوں کی زندگانی کا موجب ہوا)۔

اسی جذبے کی بازگشت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مشہور حدیث میں ملتی ہے، جس میں آپ ﷺ نے فرمایا: "مومن اپنے ایمان کے دامن سے وابستہ رہتا ہے، جب تک کہ وہ ناحق خون نہ بہائے۔"[1]

ایک اور روایت میں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قیامت کے دن آدمی سے سب سے پہلے جس چیز کے بارے میں سوال کیا جائے گا وہ اس کی نماز ہے اور لوگوں کے مابین سب سے پہلے خون کے فیصلے کیے جائیں گے۔"[2] اس سے اسلام میں انسانی جان کی عزت و حرمت کی اہمیت کا پتا چلتا ہے، خاص طور پر جنگ اور تنازعات کے درمیان جہاں خونریزی کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔

اسلامی روایت یہ ہے کہ جنگ کو نظم و ضبط کا پابند بنایا جائے، غیر مقاتلین کو نشانہ نہ بنایا جائے، کم سے کم طاقت کا استعمال ہو جس میں انتقام کا جذبہ کارفرما نہ ہو اور جنگی قیدیوں کے ساتھ انسانی سلوک کیا جائے۔ اسلام میں قتال کی اجازت صرف ان لوگوں کو دی گئی ہے جو ظلم و ستم کا شکار ہوں۔[الحج ۲۲: ۳۹] اور پھر یہ کہ ایسے کسی بھی قسم کے قتال کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہو، نہ کہ کوئی اور مقصد (جیسے عزت، دولت یا غلاموں کا حصول وغیرہ)۔ [النساء ۴: ۷۴] اسی طرح دورانِ جنگ اگر کسی کو قیدی بنا لیا جائے تو اس کے بارے میں حکم خداوندی یہ ہے: ﴿فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً حَتَّى تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا ذَلِكَ وَلَوْ يَشَاءُ اللهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلَكِنْ لِيَبْلُوَ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ﴾ [محمد ۴۷: ۴] (۔۔۔ان کو مضبوطی سے قید کر لو۔ پھر اس کے بعد یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دینا چاہیے یا کچھ مال لے کر یہاں تک کہ [فریق مقابل] لڑائی [کے]

۱۔ ریاض الصالحین، حدیث ۲۲۰

۲۔ سنن النسائی، کتاب الصلاۃ، حدیث ۴۶۶

ہتھیار [ہاتھ سے] رکھ دے۔ [یہ حکم یاد رکھو] اور اگر خدا چاہتا تو [اور طرح] ان سے انتقام لے لیتا۔ لیکن اس نے چاہا کہ تمہاری آزمائش ایک [کو] دوسرے سے [لڑوا کر] کرے)۔

مال غنیمت اور غلاموں کے ذاتی مفاد کی خاطر حصول کی بالعموم حوصلہ شکنی کی گئی ہے۔ اس آیت سے بظاہر یہ حکم پتا چلتا ہے کہ ایسے قیدیوں کو آزاد کر دیا جائے یا انہیں معاہدے یا قیدیوں کے تبادلے میں بطور فدیہ دیا جائے۔

اسلام کے ابتدائی ایام میں قتال کی اجازت نہیں تھی اور ۱۳ سالوں پر مشتمل مکی دور وہ زمانہ تھا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی پہلی نسل کو اپنے نئے دین کی وجہ سے ظلم و ستم کا سامنا کرنا پڑا۔ قتال کے حوالے سے ہدایات اور اصول وضوابط اس وقت سامنے آئے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ اس حوالے سے اسلامی روایت میں بنیادی اصول یہ رہا ہے کہ قتال حملہ آوروں کے خلاف دفاع کے طور پر کیا جائے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلا تَعْتَدُوا إِنَّ اللهَ لا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ﴾ [البقرۃ۲: ۱۹۰] (اور جو لوگ تم سے لڑتے ہیں تم بھی خدا کی راہ میں ان سے لڑو مگر زیادتی نہ کرنا کہ خدا زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا)۔ یہ آیت اس حوالے سے بڑی واضح ہے کہ قتال صرف ان لوگوں کے خلاف ہونا چاہیے جو ظلم و زیادتی کے مرتکب ہوں، اور ان لوگوں سے کوئی تعرض نہ کیا جائے جو دشمنی پر نہ اترے ہوں۔ یہ اسلام میں غیر مقاتلین کے وجود کا اعتراف ہے۔

ایسے غیر مقاتلین، جو بالواسطہ یا بلاواسطہ جنگ میں حصہ نہیں لیتے، بشمول بچے، بوڑھے، خواتین، زخمی، ذہنی یا جسمانی طور پر معذور افراد، عبادت گاہوں کی دیکھ بھال کے ذمہ دار وہ افراد جنہیں بے ضرر سمجھا جاتا ہے، ان سب کا تحفظ اسلامی قانون میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ درج ذیل احادیث نبوی میں عورتوں اور بچوں کے تحفظ کے لیے بطور خاص ہدایات دی گئی ہیں۔

حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ غزواتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے کسی ایک غزوہ میں ایک عورت مقتول پائی گئی۔ تو آپ ﷺ نے خواتین اور بچوں کے قتل کو ناپسند کیا۔[1]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک لڑائی میں ایک عورت ماری گئی تھی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا۔[2]

جنگ کے دوران عورت کی جان کے ضیاع پر رسول اللہ ﷺ کی جانب سے اظہار ناپسندیدگی اس حساسیت کو ظاہر کرتی ہے جو اسلامی روایت میں جنگ کے دوران عورتوں کے تحفظ کے بارے میں پائی جاتی ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر جنگ کے دوران حادثاتی یا غیر ارادی طور پر عورتوں یا بچوں کا قتل ہو جائے تو ان کو نظر انداز نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ صعب بن جثامہ سے مروی حدیث سے پتا چلتا ہے کہ رات کے وقت اس طرح کے اقدامات یا مہم جوئی ایسے انجام کا باعث بن سکتی ہے۔[3] تاہم عام اصول یہی ہے کہ اس حوالے سے پوری احتیاط کا مظاہرہ کیا جانا چاہیے کیونکہ ہر انسانی جان قیمتی ہے۔

اسلام میں قتال سے متعلق تفصیلی احکامات نبی کریم ﷺ کی حیات مبارکہ میں وقت کے ساتھ ساتھ مرتب ہوتے چلے گئے جب اس حوالے سے واقعات پیش آتے گئے۔ البتہ ان میں سے کچھ واقعات ہمارے موضوع کے حوالے سے کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔

غزوہ عبد اللہ بن جحش

عبد اللہ بن جحشؓ کی مہم مسلمانوں کی کفار کے ساتھ پہلی حقیقی مڈبھیڑ تھی اور یہ اسلام میں آدابِ قتال کے ارتقا کے آغاز کی عکاسی کرتی ہے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ اس مرحلے پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آدابِ قتال کے حوالے سے کوئی تفصیلی ہدایات نہیں بیان فرمائی تھیں۔

۱۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر، حدیث ۴۳۱۹

۲۔ ایضاً، حدیث ۴۳۲۰

۳۔ صحیح مسلم، حدیث ۱۷۴۵

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ بدر سے پہلے حضرت عبداللہ بن جحشؓ کو دیگر آٹھ لوگوں کے ساتھ خفیہ طور پر نخلہ کے مقام پر جو مکہ اور طائف کے درمیان ہے، قریش کی خبر گیری کے لیے بھیجا تھا۔ ہوا یہ کہ اہل مکہ کا قافلہ وہاں رجب کے آخری دن پہنچا اور حضرت عبداللہ بن جحشؓ نے ان پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ حملے میں قافلے کا ایک شخص مارا گیا جبکہ دو قیدی بنا لیے گئے، البتہ ایک شخص فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ حضرت عبداللہ بن جحشؓ نے فیصلہ کیا کہ قیدیوں اور مال غنیمت سے تعرض نہیں کیا جائے گا اور اس کا پانچواں حصہ نبی کریم ﷺ کے لیے ہو گا۔ ابن اسحاق کا کہنا ہے کہ یہ واقعہ اس حکم سے پہلے پیش آیا تھا جس میں اللہ تعالیٰ نے مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ نبی کریم ﷺ کے لیے مختص کیا تھا۔[1]

مدینہ واپسی پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جحشؓ اور ان کے ساتھیوں کی سرزنش کی اور فرمایا کہ میں نے تو تمہیں حرمت والے مہینے[2] میں قتال کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ آپ ﷺ نے قرار دیا کہ کسی واضح حکم کے آنے سے پہلے مال غنیمت سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔

اسی دوران مکہ فرار ہونے والے شخص نے قریش کو مسلمانوں کی جانب سے رجب کے مہینے میں لڑائی کی اطلاع دی جو ان پر انتہائی ناگوار گزری۔ یہی وہ وقت تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِنْدَ اللهِ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ﴾ [البقرۃ۲: ۲۱۷] ([اے محمد ﷺ] لوگ تم سے عزت والے مہینوں میں لڑائی کرنے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہہ دو کہ ان میں لڑنا بڑا [گناہ] ہے اور خدا کی راہ سے روکنا اور اس

1. Guillaume, Alfred. *The Life of Muhammad: A Translation of Ibn Ishaq's Sirat Rasul Allah*. p. 287. OUP. 1955.

۲۔ عربوں کے ہاں یہ رواج تھا کہ وہ رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم میں کسی قسم کی لڑائی سے گریز کرتے تھے۔ اس سے عربوں کے ہاں روایتی بین الاقوامی قانون کی پاسداری کا پتا چلتا ہے۔

سے کفر کرنا اور مسجد حرام (یعنی خانہ کعبہ میں جانے) سے [بند کرنا] اور اہل مسجد کو اس میں سے نکال دینا [جو یہ کفار کرتے ہیں] خدا کے نزدیک اس سے بھی زیادہ [گناہ] ہے۔ اور فتنہ انگیزی خونریزی سے بھی بڑھ کر ہے)۔ اس کے بعد مال غنیمت کی تقسیم کے حوالے سے اصول بیان کیے گئے اور اس موقف کی تصدیق کی گئی جو حضرت عبداللہ بن جحشؓ نے اختیار کیا تھا۔

یہاں اگر تجزیہ کیا جائے تو دو اہم نتائج اخذ ہوتے ہیں: اولاً یہ کہ مہم جوئی کرنے والے گروہ نے جنگ کے ایک ایسے اصول کی پیروی کی جس کی ابھی تک مشروعیت نازل نہیں ہوئی تھی، تاہم اس اصول کی کوئی نہ کوئی بنیاد ضرور تھی، چنانچہ یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ جیسے شریعت نے دیگر کئی معاملات [مثلاً دیت وغیرہ] میں زمانہ جاہلیت کے رواجات کو برقرار رکھا، اسی طرح مال غنیمت کی تقسیم کے حوالے سے یہ حکم بھی برقرار رکھا کہ اس کا پانچواں حصہ ریاست کو دیا جائے گا۔ دوسرا نکتہ جو زیادہ اہم ہے کہ سارے کا سارا مالِ غنیمت ریاست کے حوالے کیا جائے گا پھر وہ اس کی تقسیم کا تعین کرے گی۔ اس اصول کی عکاسی اس آیت سے ہوتی ہے جو اس واقعہ کے فوراً بعد نازل ہوئی: ﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الأَنْفَالِ قُلِ الأَنْفَالُ لله وَالرَّسُولِ فَاتَّقُوا اللهَ وَأَصْلِحُوا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَأَطِيعُوا اللهَ وَرَسُولَهُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ [الانفال۸: ۱] ([اے محمد! مجاہد لوگ] تم سے غنیمت کے مال کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہ [کیا حکم ہے] کہہ دو کہ غنیمت خدا اور اس کے رسول کا مال ہے۔ تو خدا سے ڈرو اور آپس میں صلح رکھو اور اگر ایمان رکھتے ہو تو خدا اور اس کے رسول کے حکم پر چلو)۔

سورۃ الانفال کے نزول پر حضرت عبادہ بن صامتؓ کا قول اس بات کی تصدیق کرتا ہے جب انہوں نے کہا: "یہ سورۃ غزوہ بدر میں شرکت کرنے والے اصحاب کے بارے میں نازل ہوئی جب ہمارے مابین مالِ غنیمت کی تقسیم کے حوالے سے اختلاف پیدا ہو گیا۔ چنانچہ جب ہمارا

اختلاف بڑھ گیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے ہم سے لے لیا اور اس کا اختیار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دیا۔[۱]

فتح مکہ

طاقت اور قوت کے اظہار کو درست طریقے سے صرف اسی وقت دیکھا جاسکتا ہے جب اس کا موقع مہیا ہو۔ کسی معاہدے پر دستخط کرنا اور اس پر عمل کرنے کی توقع کرنا ایک چیز ہے، لیکن عملاً کسی عہد کا پابند نہ ہونا اور پھر بھی انسانی ہمدردی کا اظہار کرنا ایک اور چیز ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود قوت وطاقت کے عام معافی کا اعلان فرمایا، حالانکہ مکہ والوں کی طرف سے ایک دہائی سے زائد عرصے تک مسلمان جنگ اور جبر کا شکار رہے تھے۔ آپ ﷺ نے سردارِ مکہ حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ہر اس شخص کو امان حاصل ہوگی جو ابو سفیان کے گھر میں داخل ہوا، جس نے اپنا دروازہ بند کر لیا یا جو مسجد (کعبہ) میں داخل ہوا۔[۲]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر صرف چند لوگوں سے لڑنے کے لیے خصوصی ہدایات دی تھیں اور یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے نہ صرف مزاحمت اختیار کی بلکہ وہ قتل جیسے گھناؤنے جرائم کے مرتکب تھے اور انصاف سے بچ نکلے تھے۔ لیکن ان چند افراد میں سے بھی بعض کو معاف کر دیا گیا جیسا کہ ثمامہ، عکرمہ، صفوان اور سہیل وغیرہ۔ یہ سب قریش کی دوسری نسل کے قبائلی رہنما تھے۔

فتح مکہ کے موقع پر مالِ غنیمت جس طرح تقسیم کیا گیا اس سے بھی تقسیمِ غنائم کے بارے میں پائی جانے والی عام رائے غلط ٹھہرتی ہے۔ بالفاظ دیگر یہ ریاست ہی ہے جو مال غنیمت کی تقسیم کا مکمل اختیار رکھتی ہے۔ مزید یہ کہ حالات کے پیش نظر ریاست صوابدیدی فیصلے کر سکتی ہے جس میں ان معاہدات کی پابندی بھی شامل ہے، جن کی وہ اپنی مرضی سے خود فریق بنی ہو۔ یہ واقعہ اس

۱۔ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ص ۶۲

2. Ibn Ishaq's *Sirat Rasul Allah* (Trans. By Guillaume) Pg. 548.

بات کی طرف بھی واضح اشارہ ہے کہ متحارب فریقوں کے مابین اختلافات کو رفع کرنے کے لیے عام معافی کو ترجیح دی جائے، اس لیے کہ اسلام میں دولت اور غلاموں کو جمع کرنے کی بجائے امن قائم کرنے کو ترجیح حاصل ہے۔

صلح حدیبیہ

معاہدے کی پاسداری اور حرمت کے بارے میں قرآن مجید میں بار بار حکم دیا گیا ہے: ﴿وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللهِ إِذَا عَاهَدْتُمْ وَلا تَنْقُضُوا الأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلا إِنَّ اللهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ. وَلا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ دَخَلا بَيْنَكُمْ أَنْ تَكُونَ أُمَّةٌ هِيَ أَرْبَى مِنْ أُمَّةٍ إِنَّمَا يَبْلُوكُمُ اللهُ بِهِ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ﴾ [النحل۱۶: ۹۱- ۹۲] (اور جب خدا سے عہد واثق کرو تو اس کو پورا کرو اور جب پکی قسمیں کھاؤ تو اُن کو مت توڑو کہ تم خدا کو اپنا ضامن مقرر کر چکے ہو۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس کو جانتا ہے۔ اور اُس عورت کی طرح نہ ہونا جس نے محنت سے توسوت کاتا۔ پھر اس کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ کہ تم اپنی قسموں کو آپس میں اس بات کا ذریعہ بنانے لگو کہ ایک گروہ دوسرے گروہ سے زیادہ غالب رہے۔ بات یہ ہے کہ خدا تمہیں اس سے آزماتا ہے۔ اور جن باتوں میں تم اختلاف کرتے ہو قیامت کو اس کی حقیقت تم پر ظاہر کر دے گا)۔

قرآن مجید میں اس موضوع پر بہت سی آیات ہیں۔ ان میں سے کچھ ذیل میں مذکور ہیں: ﴿وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُونَ سُوءَ الْحِسَابِ. وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلاةَ وَأَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلانِيَةً وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ أُولَئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ﴾ [الرعد۱۳: ۲۱- ۲۲] (اور جن [رشتہ ہائے قرابت] کے جوڑے رکھنے کا خدا نے حکم دیا ہے ان کو جوڑے رکھتے اور اپنے پروردگار سے

ڈرتے رہتے اور برے حساب سے خوف رکھتے ہیں۔ اور جو پروردگار کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے [مصائب پر] صبر کرتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں اور جو [مال] ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور ظاہر خرچ کرتے ہیں اور نیکی سے برائی دور کرتے ہیں یہی لوگ ہیں جن کے لیے عاقبت کا گھر ہے)۔

﴿بَلَى مَنْ أَوْفَى بِعَهْدِهِ وَاتَّقَى فَإِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ. إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلا أُولَئِكَ لا خَلاقَ لَهُمْ فِي الآخِرَةِ وَلا يُكَلِّمُهُمُ اللهُ وَلا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ [آل عمران۳: ۷۶- ۷۷] (ہاں جو شخص اپنے اقرار کو پورا کرے اور [خدا سے] ڈرے تو خدا ڈرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ جو لوگ خدا کے اقراروں اور اپنی قسموں [کو بیچ ڈالتے ہیں اور ان] کے عوض تھوڑی سی قیمت حاصل کرتے ہیں ان کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں ان سے خدا نہ تو کلام کرے گا اور نہ قیامت کے روز ان کی طرف دیکھے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کو دکھ دینے والا عذاب ہو گا)۔

﴿وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾ [البقرۃ۲: ۱۷۷] (اور جب عہد کرلیں تو اس کو پورا کریں۔ اور سختی اور تکلیف میں اور [معرکہ] کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں۔ یہی لوگ ہیں جو [ایمان میں] سچے ہیں اور یہی ہیں جو (خدا سے) ڈرنے والے ہیں)۔

﴿وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَى وَبِعَهْدِ اللهِ أَوْفُوا ذَلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾ [الانعام۶: ۱۵۲] (اور جب [کسی کی نسبت] کوئی بات کہو تو انصاف سے کہو گو وہ [تمہارا] رشتہ دار ہی ہو اور خدا کے عہد کو پورا کرو ان باتوں کا خدا تمہیں حکم دیتا ہے تاکہ تم نصیحت کرو)۔

﴿وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولا﴾ [الاسراء۱۷: ۳۴] (اور عہد کو پورا کرو کہ عہد کے بارے میں ضرور پرسش ہوگی)۔

اسلامی روایت میں تنازعات کے دوران معاہدوں کی پاسداری کی صلح حدیبیہ سے بڑھ کر کوئی مثال نہیں ہوسکتی جس کی کئی شرائط مسلمانوں کے لیے ناموزوں تھیں، تاہم محض امن کا ماحول پیدا کرنے کی خاطر اس پر اتفاق کیا گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم معاہدے پر قائم رہے اور اہل مکہ کے نمائندے سہیل بن عامر کے کہنے پر رسول اللہ کا لقب بھی ہٹا دیا، جسے مسلمانوں نے توہین آمیز سمجھا۔

معاہدے کی مشکل شرائط کو عملی طور پر برقرار رکھنے کا ثبوت ابو جندل کے معاملے میں فوراً سامنے آگیا جو معاہدہ طے پانے کے فوراً بعد مسلمان ہوئے تھے اور انہوں نے مدینہ منورہ جانے کی کوشش کی تھی۔ مسلمانوں پر حضرت ابو جندلؓ کو اہل مکہ کو واپس کرنا سخت گراں تھا؛ تاہم یہ معاہدہ کی شرائط کے مطابق مکہ کے شہری ہونے کی بنا پر انہیں واپس کر دیا گیا۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت یوں فرمائی: "ہم نے ان لوگوں کے ساتھ صلح کا معاہدہ کیا ہے اور اللہ کے نام پر ہم نے انہیں عہد دیا ہے اور انہوں نے ہمیں عہد دیا ہے اور ہم ان سے عہد شکنی نہیں کریں گے۔"[۱]

یہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ جنگ بندی کے دوران جنگ کے اصول معطل کر دیے جاتے ہیں اور جنگ بندی کی خاطر جن شرائط اور نکات پر اتفاق کیا گیا ہو ان پر عمل پیرا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کی جانب سے یہ موقف اختیار کیا گیا ہے کہ اسلام میں قتال کا مقصد تلوار کے زور پر دین پھیلانا ہے، اس واقعہ سے اس کی نفی ہوتی ہے۔

زہری بیان کرتے ہیں: صلح حدیبیہ سے پہلے کوئی بھی فتح اس سے بڑھ کر نہیں تھی۔ فریقین کا سامنا ہمیشہ جنگ و جدال کی صورت میں ہی ہوتا تھا؛ تاہم جب لڑائی کی بجائے جنگ بندی ہوئی تو

۱۔ مسند امام احمد بن حنبل، حدیث ۱۸۹۱۰

لوگوں نے خود کو محفوظ تصور کیا، وہ ایک ساتھ بیٹھے اور تنازعات پر بات چیت کی۔ چنانچہ جس نے بھی اسلام کے حوالے سے غور و فکر سے کام لیا وہ فوراً مسلمان ہو گیا۔ ان دو سالوں میں اس قدر لوگ مسلمان ہوئے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے۔[1] ابن ہشام نے اس بات کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر اصحاب رسول ﷺ کی تعداد ۱۴۰۰ تھی جو فتح مکہ کے موقع پر بڑھ کر ۱۰،۰۰۰ ہو گئی تھی۔ قرآن مجید کی ایک آیت اس واقعہ کے اثرات کو مختصراً اس طرح بیان کرتی ہے: ﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُبِينًا﴾ [الفتح ۴۸: ۱] ([اے محمد ﷺ] ہم نے تم کو فتح دی۔ فتح بھی صریح وصاف)۔

اس ساری بحث سے یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ شریعت میں ریاست ان معاہدات کی پابند ہوتی ہے جن پر اس نے دستخط اور ان کی توثیق کی ہو، اس لیے کہ عہد وپیماں کو پورا کرنا لازمی ہے۔ اس سے آپ کے آپ معلوم ہو جاتا ہے کہ بین الاقوامی معاہدات جیسے جنیوا کنونشنز کے تحت ذمہ داریوں کو نیک نیتی سے پورا کرنا گویا کہ اسلامی قانون کی پابندی کرنا ہے اور ایک اسلامی ریاست سے اسلامی قانون کی پابندی کی توقع کی جاتی ہے۔

اسلامی بین الاقوامی قانون، السیر

السیر، سیرۃ کی جمع ہے جس کا مطلب راستہ، طریقہ، یا طرز عمل ہے۔ السیر سے مراد بنیادی طور پر جنگ کے یا امن سے متعلق قواعد وضوابط ہیں۔ امام ابوزہرہ نے اس کی تعریف یوں کی ہے: "جہاد اور جنگ کے احکام، اس میں کیا جائز ہے اور کیا نہیں، اور [مستقل] صلح کے معاہدوں اور عارضی صلح کے احکام، اور یہ کہ کون حربی سمجھا جائے گا اور کون نہیں، مال غنیمت، تاوان اور غلامی کے قوانین کے ساتھ ساتھ دیگر مسائل جو جنگوں اور اس کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ مختصراً، یہ امن

۱۔ البدایہ والنہایہ، ص ۲۵۰

اور جنگ کے دوران مسلمانوں اور دیگر [قوموں] کے درمیان بین الاقوامی تعلقات کے اصول و ضوابط سے بحث کرتا ہے، اگرچہ زیادہ تر بحث جنگ کے بارے میں ہوتی ہے۔[1]

شیبانی نے السیر میں معاہدے کی تعریف یہ کی ہے: "معاہدہ (موادعہ) عقد (لفظی طور پر باندھنا یا جوڑنا) کی ایک شکل ہے جو کسی خاص عمل پر اتفاق کی علامت ہے اور یہ قانونی اثرات کا سبب ہوتا ہے۔"[2]

مسلم فقہا اور مغربی مصنفین ان بین الاقوامی دستاویزات کے لیے "معاہدہ" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں جن پر عمل پیرا ہونا لازم ہوتا ہے۔ عربی زبان میں اس مفہوم میں کئی اصطلاحات ہیں جیسے عقد (عہد)، موادعہ یا معاہدہ، میثاق، صلح اور حلف۔ معاہدوں کا بنیادی مقصد صرف امن کی بحالی تک محدود نہیں ہے، بلکہ کئی دیگر امور بھی ہوتے ہیں جیسے کہ خارجہ امور کو منظم کرنا۔

معاہدوں کے نفاذ کے ذریعے اسلام کا مقصد بین الاقوامی سطح پر خیر خواہی اور امن قائم کرنا ہے۔ مزید یہ کہ اس کا مقصد مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کو برقرار رکھنا تھا۔ اسلام میں معاہدوں کی پاسداری پر بڑا زور دیا گیا ہے؛ کیونکہ مسلمان اخلاقی اور قانونی طور پر اپنے معاہدوں کے پابند ہیں۔ اس حوالے سے یہاں یہ ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا کہ معاہدات کے حوالے سے یہ شرط ہوتی ہے کہ وہ کسی فریق ریاست کے آئین کے خلاف نہ ہو، اس کے نمائندوں نے معاہدات کرتے ہوئے اپنے اختیارات سے تجاوز نہ کیا ہو۔ اسی طرح اگر کوئی ایک فریق معاہدے کی خلاف ورزی کرے تو دوسرے فریق کو معاہدہ منسوخ کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ معاہدے میں ترمیم کے لیے باہمی رضامندی ضروری ہے۔ اس کی مثال صلح حدیبیہ کی ہے، جب مسلمانوں نے قریش سے مکہ میں مزید ایک دن قیام کے لیے کہا تو انہوں نے انکار کر دیا اور معاہدے کے

---

1. Munir, Muhammad. *Islamic International Law (Siyar): An Introduction*. International Islamic University Islamabad. pg. 9.

۲۔ محمد بن حسن شیبانی، السیر الکبیر ۴: ۶۰

مطابق مسلمانوں کو صرف تین دن کی اجازت دی۔ اسلام میں معاہدوں کی حرمت اور ان سے روگردانی کو کس طرح شریعت کی خلاف ورزی سمجھا جاتا ہے یہ نکات اس حوالے سے بڑے اہم ہیں۔ قرآن میں ارشاد ربانی ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لا تَفْعَلُونَ. كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لا تَفْعَلُونَ﴾ [الصف ۶۱: ۲- ۳] (اے ایمان والو! تم ایسی باتیں کیوں کہا کرتے ہو جو کیا نہیں کرتے۔ خدا اس بات سے سخت بیزار ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں)۔

خلفائے راشدین

ساتویں صدی کے اوائل میں، خلیفہ اول حضرت ابو بکرؓ نے اپنے لشکر کو ہدایت دیتے ہوئے حکم دیا کہ لاشوں کو مسخ نہ کیا جائے، بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو قتل نہ کیا جائے۔ اسی طرح انہوں نے درختوں کو نقصان پہنچانے اور دشمن کے جانوروں کو مارنے سے منع فرمایا:

"میں آپ کو دس چیزوں سے باز رہنے کی تاکید کرتا ہوں: (۱) کسی عورت (۲) یا بچے کو، (۳) یا بوڑھے، کو قتل نہ کرنا۔ (۴) کسی پھل دار درخت کو نہ کاٹنا۔ (۵) کسی تعمیر شدہ جگہ کو تباہ و برباد نہ کرنا (۶) کھانے کے علاوہ بکری یا اونٹ ذبح نہ کرنا۔ (۷) نہ انہیں جلانا (۸) کھجور کے باغات کو تباہ و برباد نہ کرنا؛[1] (۹) میدان جنگ سے مال غنیمت کا ناجائز استعمال نہ کرنا اور (۱۰) بزدلی نہ دکھانا۔"[2]

حضرت عمر بن خطابؓ کے دورِ خلافت میں ایسے کئی واقعات پیش آئے جن سے جنگی قیدیوں کے حوالے سے اسلامی نقطۂ نظر بڑی حد تک واضح ہو جاتا ہے۔ حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ نے جب اسلامی لشکر کی قیادت کرتے ہوئے ایرانی علاقے نہر شیر کا محاصرہ کیا اور دجلہ اور فرات کے کناروں پر حملہ کیا تو انہوں نے ایک ہزار سے زائد لوگوں کو جن میں زیادہ تر کسان تھے قیدی بنالیا،

۱۔ اس روایت میں کھجور کے درخت کا ذکر ہے تاہم جب باقی روایات کی روشنی میں اس کا مطالعہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ یہ شہد کی مکھیوں کے بارے میں ہے۔

۲۔ مالک بن انس، الموطا، حدیث ۱۲۹۳

اور حضرت عمرؓ کو لکھا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ جواب میں حضرت عمرؓ نے انہیں ہدایت کی کہ "اگر یہ کسان آپ کے ساتھ کیے گئے معاہدے کی پاسداری کریں اور دشمن کی مدد کرنے سے باز رہیں تو انہیں عام معافی دے دو۔"[1] چنانچہ جب ان کی جانب سے عہد کی پاسداری کی گئی تو حضرت سعدؓ نے انہیں آزاد کر دیا۔

دوسرا اہم واقعہ اہل دمشق کے ہتھیار ڈالنے کا ہے، جب حضرت ابوعبیدہؓ نے بغیر کسی جنگ کے اہل دمشق کو ہتھیار ڈالنے پر قائل کر لیا۔ اس پر حضرت خالد بن ولیدؓ نے سخت ناراضی کا اظہار فرمایا؛ تاہم حضرت ابوعبیدہؓ اپنے موقف پر قائم رہے اور فرمایا کہ میں انہیں اپنا عہد دے چکا ہوں اور اس کی پاسداری کروں گا، ہتھیار ڈالنے والوں کی جان و مال کی حفاظت کی جائے گی۔ چنانچہ دونوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ اس مسئلہ پر خلیفہ وقت سے پوچھ لیا جائے، جو ان کے علم کے مطابق اس وقت حضرت ابو بکرؓ تھے۔ جب ان کا خط مدینہ پہنچا تو اس وقت حضرت ابو بکرؓ کا انتقال ہو چکا تھا اور حضرت عمرؓ خلیفہ بن چکے تھے۔ حضرت عمرؓ نے خط کے جواب میں حضرت ابوعبیدہؓ کو سپہ سالار مقرر کر دیا اور ان کی رائے سے اتفاق کیا۔ خط کا ایک حصہ درج ذیل ہے:

> مسلمانوں کو مالِ غنیمت کی خاطر تباہی میں نہ جھونکیں۔۔۔ مسلمانوں کو تباہی کی طرف دھکیلنے کے دھوکے سے بچیں۔ اپنی نگاہیں دنیا سے ہٹائے رکھو اور اپنے دل کو اس میں مشغول نہ رکھیں۔ اپنے سے پہلے والوں کی طرح تباہ ہونے سے بچیں۔ آپ کو ان کی بربادی کا بخوبی علم ہے۔۔۔ جہاں تک آپ کا خالدؓ کے ساتھ اس بات پر اختلاف ہے کہ فتح پُرامن ہتھیار ڈالنے سے ہوئی تھی یا بزور شمشیر، تو اب سپہ سالار آپ ہیں۔ رومیوں کے ساتھ آپ کو اپنے معاہدے کی پاسداری کرنی چاہیے۔[2]

۱۔ واقدی، کتاب التاریخ والمغازی ۲: ۱۶۱

۲۔ ایضاً، ص ۱۶۲

اس واقعہ کے کئی لوگ شاہد تھے جن میں ضرار بن ازور بھی شامل تھے، انہوں نے جب حضرت ابو عبیدہؓ کے معاہدے کو ایک گھاٹے کا سودا قرار دیا تو ان کے ساتھی عطیہ بن عامر نے کہا: "اے ابن ازور، امین الامت (حضرت ابو عبیدہؓ) نے خون بچا کر مسلمانوں کی خیر خواہی چاہی ہے۔ درحقیقت انسانی جان کی حرمت ہر اس چیز سے بہتر ہے جس پر سورج طلوع ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے دلوں میں رحم ڈال دیا ہے اور اپنی نازل کردہ کتاب میں فرمایا ہے: "والصلح خیر" (اور صلح بہترین ہے) [النساء۴: ۱۲۸]۔ مزید یہ کہ حدیث مبارکہ ہے کہ "رب رحم نہ کرنے والوں پر رحم نہیں کرتا"۔ اس پر ضرار نے ان سے اتفاق کیا۔ یہاں ایک بار پھر فتح مکہ کے جذبے کی عکاسی ہوتی ہے، جہاں میدان جنگ میں فتح کے وقت صلح کو ترجیح دی گئی۔

پانچویں خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبد العزیز کا طرز عمل اسلامی نقطہ نظر کے تسلسل کو واضح کرتا ہے۔ ایک دفعہ انہوں نے اپنے صوبائی گورنر کو لکھا: "ہم تک یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی جنگی مہم پر فوجی دستہ بھیجتے تو انہیں ہدایت فرماتے: "اللہ کا نام لے کر نکلو اور اللہ کی راہ میں نکلو، ان سے لڑو جو اللہ کا انکار کرتے ہیں۔ مالِ غنیمت میں خیانت نہ کرنا، عہد شکنی نہ کرنا، دشمنوں کی لاشوں کو مسخ نہ کرنا، اور کسی بچے کو قتل نہ کرنا۔" یہ پیغام اپنے لشکر اور فوجی دستوں تک پہنچاؤ۔ تم پر اللہ کی سلامتی ہو۔[1]

خواتین قیدیوں کا مسئلہ

قیدیوں کے موضوع پر شاید یہ سب سے زیادہ متنازعہ مسائل میں سے ایک ہے۔ خواتین قیدیوں اور ان کی آبروریزی کے حوالے سے ایک بڑی غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ اسلام میں اسے بدستور جائز رکھا گیا ہے، جو کہ واضح طور پر ایسا نہیں ہے۔ اسلامی قانون کی بنیاد اسوۂ رسول ﷺ پر ہے۔ تاہم عام طور پر اس موضوع کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے زیر غور نہیں لایا جاتا۔

۱۔ الموطا، حدیث ۱۲۹۴

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی ازواج مطہرات ایسی تھیں جو پہلے قیدی یا اسیر تھیں۔ چنانچہ اگر اسلامی نقطۂ نظر کے حوالے سے کوئی اصول وضع کرنے ہیں تو ان کا مدار اسوۂ رسول ﷺ پر ہونا چاہیے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ ریحانہ بنت زید بنی نضیر سے تعلق رکھتی تھیں، جو کہ ایک یہودی قبیلہ تھا اور اس نے مدینہ منورہ میں مسلمانوں کے خلاف بغاوت کی تھی۔ ریحانہ کو آزاد کر دیا گیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح فرمالیا۔ انہیں مہر، جہیز اور گھر اس طرح دیا گیا جس طرح باقی ازواج مطہرات کو دیا گیا تھا۔[1] باقی ازواج مطہرات کے ساتھ وہ جنت البقیع میں دفن ہیں اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں ہوا تھا۔ یہ اس بات کا واضح اشارہ ہے کہ ریحانہ کو آزاد کرنا ایک اہم فیصلہ تھا اور شادی میں رضامندی کی اہمیت ہے۔

ایسا ہی معاملہ صفیہ بنت حیی کے حوالے سے ذکر کیا جا سکتا ہے، جو جنگ خیبر کے دوران پیش آیا۔ ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کیا تھا اور ان کا مہر ان کی رہائی کو قرار دیا۔[2] واقدی نے ذکر کیا ہے کہ "صحابہ اس سوچ میں تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قیدی عورت "صفیہ" سے نکاح کریں گے یا اسے اپنی لونڈی بنائیں گے، پھر جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنا چہرہ ڈھانپنے کا کہا تو معلوم ہو گیا کہ آپ ﷺ نے ان سے نکاح کر لیا ہے۔[3]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ماریہ قبطیہ کے ساتھ معاملہ اور بھی زیادہ واضح ہے، جو کہ ایک غلام باندی تھیں اور مصر کے بادشاہ مقوقس کی جانب سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور تحفہ دی گئی تھیں۔ صحابی رسول حضرت حاطب ابن ابی بلتعہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام لے کر مقوقس کے پاس گئے تو اس نے جواب میں آپ ﷺ کی خدمت میں کئی تحائف بھیجے۔ ان تحائف میں سے دو غلام بہنیں بھی تھیں، ماریہ قبطیہ اور ان کی بہن شیریں۔ حاطب نے مدینہ

۱۔ ابن حجر، الإصابہ ۴: ۳۰۹

۲۔ صحیح بخاری، حدیث ۶۸

۳۔ واقدی، کتاب المغازی، ص ۳۹۹

پہنچنے سے پہلے ان دونوں کو اسلام کی دعوت دی جو انہوں نے قبول کر لی۔[۱] روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح فرمالیا تھا اور وہ آزاد ہو گئی تھیں۔ طبری،[۲] حاکم[۳] وغیرہ نے اسی موقف کی تائید کی ہے۔

جویریہ بنت الحارث کا قصہ بھی اہم ہے کہ ان کے قبیلے بنو مصطلق کے ہتھیار ڈالنے کے فوراً بعد رسول اللہ ﷺ نے ان سے نکاح فرمالیا تھا، جس کے نتیجے میں نہ صرف کہ وہ آزاد ہو گئیں بلکہ خود پورے قبیلے نے اس وجہ سے اسلام قبول کر لیا۔ محمود احمد غضنفر اس معاملے کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> موقع ملتے ہی (اپنی گرفتاری کے بعد) وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئیں اور اپنا مقدمہ آپ ﷺ کے سامنے پیش کیا اور عرض کیا کہ وہ ایک سردار کی بیٹی ہے، جو حکم چلاتی تھی، اب اپنی بد قسمتی کی وجہ سے خود کو اس بے بس حالت میں پاتی ہے۔ طلائی تخت سے وہ خاک پر آگئی ہے۔۔۔ وہ غلامی کی زندگی کیسے گزار سکتی ہے؟ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ وہ جس قابل رحم اور مایوس کن حالت میں ہے اس کا ازالہ فرمائیں۔[۴]

اس پر رسول اللہ ﷺ ان کی رہائی کے لیے خود ادائیگی فرمائی اور وہ آپ ﷺ سے شادی کرنے پر رضامند ہو گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صحابہ نے وہ تمام مالِ غنیمت جو ان کے قبیلے سے ملا تھا انہیں واپس کر دیا، اس لیے صحابہ کرامؓ کے لیے یہ بات ناگوار تھی کہ وہ ایسا مال کو اپنے پاس رکھیں جس کا تعلق رسول اللہ ﷺ کے سسرالی خاندان سے ہے۔ اس کے بعد قبیلہ بنو مصطلق کی اکثر لوگ مسلمان ہو گئے۔

۱۔ ابو جعفر طبری، تاریخ طبری ۹: ۱۳۱

۲۔ ایضاً، ص ۱۳۷

۳۔ حاکم، المستدرک، حدیث ۶۸۱۹

4. Mahmood Ahmad Ghadanfar, *Great Woman of Islam*, pg.108-109.

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی ازواج مطہراتؓ پہلے قیدی تھیں لیکن آپ ﷺ کے ان کا درجہ بڑھا کر ان کو آزاد کر دیا اور انہیں نکاح میں مکمل خود مختاری دی: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِمَنْ فِي أَيْدِيكُمْ مِنَ الأَسْرَى إِنْ يَعْلَمِ اللهُ فِي قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُؤْتِكُمْ خَيْرًا مِمَّا أُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ [الانفال۸: ۷۰] (اے پیغمبر جو قیدی تمہارے ہاتھ میں [گرفتار] ہیں ان سے کہہ دو کہ اگر خدا تمہارے دلوں میں نیکی معلوم کرے گا تو جو [مال] تم سے چھن گیا ہے اس سے بہتر تمہیں عنایت فرمائے گا اور تمہارے گناہ بھی معاف کر دے گا اور خدا بخشنے والا مہربان ہے)۔

ان امر کی عکاسی ایک حدیث نبوی میں ہوئی ہے جس کے الفاظ ہیں: "اگر تم میں سے کسی کے پاس لونڈی ہو جسے وہ اچھی تعلیم اور بہترین تربیت دے پھر اسے آزاد کر کے اس سے شادی کر لے تو اس کے لیے دوگنا اجر ہے۔"[1]

یہ خیال کہ اسلام غلامی کو ترویج دینے کے لیے آیا تھا مسلمہ تاریخی روایت سے غلط قرار پاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غلامی کی اجازت تو تھی لیکن اس کی حوصلہ افزائی قطعاً نہیں کی گئی۔ اس لیے کہ غلامی کا ادارہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے موجود تھا، لیکن جو چیز موجود نہیں تھی وہ ان کے حقوق تھے، اور غلاموں کا ایک اہم حق آزادی کا حق تھا۔ قرآن میں ارشاد ہے: ﴿وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لا يَجِدُونَ نِكَاحًا حَتَّى يُغْنِيَهُمُ اللهُ مِنْ فَضْلِهِ وَالَّذِينَ يَبْتَغُونَ الْكِتَابَ مِمَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوهُمْ إِنْ عَلِمْتُمْ فِيهِمْ خَيْرًا وَآتُوهُمْ مِنْ مَالِ اللهِ الَّذِي آتَاكُمْ وَلا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِتَبْتَغُوا عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَنْ يُكْرِهُّنَّ فَإِنَّ اللهَ مِنْ بَعْدِ إِكْرَاهِهِنَّ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ [النور۲۴: ۳۳] (اور جن کو بیاہ کا مقدور نہ ہو وہ پاک دامنی کو اختیار کیے رہیں یہاں تک کہ خدا ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے۔ اور جو غلام تم سے مکاتبت چاہیں اگر تم

۱۔ صحیح بخاری، حدیث ۵۰۸۳

ان میں [صلاحیت اور] نیکی پاؤ تو ان سے مکاتبت کر لو۔ اور خدا نے جو مال تم کو بخشا ہے اس میں سے ان کو بھی دو۔ اور اپنی لونڈیوں کو اگر وہ پاک دامن رہنا چاہیں تو [بے شرمی سے] دنیاوی زندگی کے فوائد حاصل کرنے کے لئے بدکاری پر مجبور نہ کرنا۔ اور جو ان کو مجبور کرے گا تو ان [بیچاریوں] کے مجبور کیے جانے کے بعد خدا بخشنے والا مہربان ہے)۔

یہ آیات عبداللہ بن سہل کے بارے میں نازل ہوئی تھیں جو اپنی بعض لونڈیوں کو جسم فروشی اور جنسی تعلقات پر مجبور کرتا تھا۔[1] لیکن ان آیات کے عربی الفاظ پر غور سے کئی دلچسپ نتائج سامنے آتے ہیں۔

(۱) ابن کثیر لکھتے ہیں کہ بغی جس کا ترجمہ "فحاشی" ہے، اس میں زنا یا غیر قانونی جنسی تعلق بھی شامل ہے،[2] جو عورتوں کو شادی کی حدود سے باہر جنسی میل جول کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

(۲) لفظ "شادی کا خواہشمند ہونا" لفظ "اَردن" کا ٹھیک ترجمہ نہیں جس کا مطلب ہے ارادہ کرنا یا اندرونی فیصلہ کرنا اور ایسا اندرونی فیصلہ جو عفت یا پاکیزگی کو برقرار رکھنے کے لیے ہو۔

(۳) عفت یا تحصّن کی خواہش نہ صرف پاکیزگی کی نشاندہی کرتی ہے بلکہ محفوظ رہنا بھی ہے جو ان کی قربت تک رسائی کو محفوظ رکھنے کے جسمانی عنصر کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

آیت کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر خواتین قیدی یا آپ کے ماتحت قیدیوں میں موجود خواتین شادی کی حدود سے باہر جنسی تعلقات قائم کرنا نہیں چاہتیں تو ایسی عورتوں کے سرپرستوں پر لازم ہے کہ وہ نہ صرف ان کی شادی کرنے میں مدد کریں بلکہ اس وقت تک ان کی عزت اور عفت کی حفاظت کریں۔

۱۔ صحیح مسلم، حدیث ۷۱۸۰، ۷۱۸۱

۲۔ ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر ۷: ۳۰۴

یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض روایات سے مزید پختہ ہوتی ہے: "اگر کسی آدمی کے سر میں لوہے کی سوئی چبھوئی جائے تو یہ اس کے لیے اس سے بہتر ہو گا کہ وہ ایسی عورت کو چھوئے جو اس کے لیے جائز نہیں۔"[۱]

امام مالک بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غلاموں کی حفاظت پر مامور شخص نے ایک لونڈی سے اس کی مرضی کے بغیر ہم بستری پر مجبور کیا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اسے کوڑے مارے اور ملک بدر کر دیا لیکن لونڈی کو کوئی سزا نہیں دی اس لیے کہ اسے مجبور کیا گیا تھا۔[۲] یہ واقعہ سورۃ النور کی آیت ۳۳ میں بیان کردہ حکم کی تائید کرتا ہے۔ تمارا سون[۳] اور رب انتصار[۴] جیسے محققین اس بات سے متفق ہیں کہ خواتین قیدیوں کے ساتھ جبری جنسی تعلقات قائم کرنا اسلامی اصولوں کے منافی ہے۔

اسلام میں جنسی تعلقات سے متعلق ہدایات احترام اور نرمی کے تصورات پر مبنی ہے۔ خواتین اور بچوں کے خلاف تشدد کی روک تھام ایک مسلّمہ اسلامی اصول ہے۔ قرآن مجید اور احادیثِ رسولؐ میں جنسی تشدد کی مختلف شکلوں کی پرزور مذمت آئی ہے جیسے پاک باز خواتین پر زنا کا جھوٹا الزام لگانا (قدف المحصنات)، جبری شادی اور عَصمت دری وغیرہ۔[۵]

اسلامی قانون میں ان حاملہ خواتین کو خصوصی تحفظ فراہم کیا گیا ہے جو جنگ میں قیدی بن جائیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی سے "خواتین قیدیوں کے ساتھ کسی قسم کے جنسی تعلق سے منع فرمایا تھا، جب تک کہ ان کا استبراء رحم نہ ہو جائے۔"[۶] مزید برآں یہ کہ جن خواتین کی

۱۔ طبرانی، المعجم الکبیر، حدیث ۴۸۶

۲۔ صحیح بخاری، حدیث ۶۹۴۹

3. Sonn, Tamara. *Islam: History, Religion, and Politics*. John Wiley & Sons. 2015, pg. 18.
4. Rabb Intisar. *Doubt in Islamic Law*. Cambridge University Press. pg.152.
5. Rahima, Swara. *Islam Rejects Sexual Violence*. (Blog 2020) (https://swararahima.com/en/2020/10/05/islam-rejects-sexual-violence/)

۶۔ جامع ترمذی، حدیث ۱۵۶۴

جنگ میں گرفتاری سے پہلے شادی ہو چکی ہو، ان کی شادی کو تسلیم کیا جائے گا اور اس طرح اس کے ساتھ جنسی میل جول نہیں ہو سکتا، خواہ حالات کچھ بھی ہوں۔ خلیفہ سوم حضرت عثمان بن عفانؓ کا بھی یہی طرزِ عمل تھا، اور امام مالک نے حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ سے بھی ایسا ہی واقعہ نقل کیا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ شادی شدہ لونڈی ان ممکنہ خواتین میں شامل نہیں جن سے جنسی تعلق قائم کیا جا سکتا ہے۔[1]

عورت کو اس کے بچوں سے الگ کرنے کا تصور جو امریکہ میں رائج غلامی کی روایات کا حصہ رہا ہے اور جس کا عکس حالیہ برسوں میں سابق امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی امیگریشن پالیسی میں نظر آتا ہے، واضح طور پر اسلام کی تعلیمات سے منافی ہے۔ اسلام افرادِ خاندان کے درمیان جدائی کا قطعاً قائل نہیں خواہ وہ جنگی قیدی ہی کیوں نہ ہوں۔ امام احمد بن حنبل کی رائے میں یہ قطعی طور پر حرام ہے کہ غلام عورت کو اس کے بچوں سے الگ کر دیا جائے، خواہ وہ دونوں اس پر راضی ہوں یعنی جنگی قیدی عورت اور اس کا آقا۔

یہ تصور کہ اسلام میں غلاموں بالخصوص باندیوں کو کم تر سماجی حیثیت حاصل تھی، رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث سے واضح طور پر نفی ہوتی ہے: تم میں سے کوئی یہ ہر گز نہ کہے: میرا غلام یا میری باندی، اس لیے کہ تم سب اللہ کے بندے اور باندیاں ہو۔[2]

اس روایت میں اسلام نے غلاموں اور باندیوں کو جو عزت دی ہے اس کا بیان ہے یعنی کہ وہ باقی تمام انسانوں کی طرح اللہ کے بندے ہیں اور ان کے ساتھ کسی قسم کے توہین آمیز رویے کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔ جمہور فقہا کی رائے کہ اصولاً ہر انسان آزاد ہے اور غلامی اس سے وقتی طور پر ایک استثنا ہے، نامور فقیہ امام سرخسیؒ اس کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں: آزاد اور غلام

---

1. Saad, Salma, *The Legal and Social Status of Women in the Hadith Literature*, University of Leeds (1990), pg. 256.

۲۔ صحیح مسلم، حدیث ۵۵۹۱

دونوں ایک ہی نوع سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے کہ انسان اپنی حقیقی حالت میں آزاد ہے، البتہ وہ غلامی کا شکار ہو سکتا ہے تاہم غلامی کی یہ حالت اس کو آزاد کرنے سے ختم ہو جاتی ہے۔

خلاصہ بحث

ماضی قریب میں داعش کی جانب سے یزیدی خواتین کو جس طرح جنسی ہراسگی کا نشانہ بنایا گیا اور اسلامی قانون سے اس کا جواز فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس سے عہد حاضر میں مسلمانوں کو درپیش چیلنجز کا پتا چلتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ اسلام میں جنسی تعلق کی اجازت کئی شرائط کے ساتھ خاص ہے، حتی کہ جنگی قیدی خواتین کے ساتھ جنسی تعلق کی اگر کوئی اجازت ہے تو اس میں بھی ان کی رضامندی کو اہمیت حاصل ہے۔ داعش کے حوالے سے جو اکثر شواہد ہمارے سامنے آئے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ زیادہ تر جنسی تشدد کا رویہ اختیار کیا گیا ہے۔

البتہ یہاں یہ بات زیر نظر رہے کہ اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ عہد حاضر میں اسلامی حکومتوں میں خواتین قیدیوں کے ساتھ شریعت کی روح کے مطابق سلوک نہیں کیا گیا۔ صومالیہ میں اسلامی عدالتوں اور افغانستان میں امارت اسلامیہ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں، بالخصوص یوون رڈلی خاتون قیدی کا واقعہ ایک واضح مثال ہے جس نے دوران قید طالبان کی جانب سے اپنے ساتھ ہونے والے برتاؤ کی وجہ سے اسلام قبول کر لیا۔

اسلامی روایت میں معاہدے یا میثاق کی پاس داری کی اہمیت اس قدر ہے کہ اگر کسی معاہدے کی بعض شرائط مسلمانوں کے لیے ناموزوں بھی ہوں لیکن وہ قیام امن کا باعث بن رہا ہو تو اس پر عمل درآمد کیا جائے گا۔ یہ بات صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے لیے خاص نہیں بلکہ عصر حاضر کے تناظر میں اس پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ مختلف معاہدات بالخصوص جنگی آداب سے متعلق جنیوا کنونشنز کی پاس داری کرنی چاہیے۔

اسلام میں ہر قسم کے تشدد بشمول خواتین کے ساتھ جنسی تشدد کی مذمت کی گئی ہے چاہے وہ دوران جنگ ہو یا داخلی خلفشار کے دیگر احوال۔ مصر کے مفتی اعظم ڈاکٹر شوقی ابراہیم عالم نے

حالیہ فتویٰ میں واضح طور پر قرار دیا ہے: "عورت پر جنسی تشدد بلاشبہ ایک کبیرہ گناہ اور شریعت کی نظر میں انتہائی مکروہ عمل ہے۔ جنسی تشدد کا اظہار صرف ان افراد کی جانب سے کیا جاتا ہے جو اپنی خواہشات اور نفس کے غلام ہوں، تاکہ وہ اپنی جنسی بھوک کو بغیر کسی منطق اور انسانی اقدار کے محض حیوانی جبلت سے مٹائیں۔"[1]

سوال وجواب

شگفتہ عمر: عادل شاہ صاحب نے ذکر کیا کہ اسلام میں غلامی کا جواز صرف جنگ کی صورت میں باقی رہ گیا ہے۔ اس میں بھی معاہدات کے ساتھ اس کا تعلق ہے جس کی تفصیل انہوں نے بیان کی ہے، لیکن جب اس بارے میں سوال ہوتا ہے تو علما قرآنی تفاسیر کے حوالے سے یا فقہ کی کتابوں کے حوالے سے اس وقت کے تناظر کے لحاظ سے اس سوال کا جواب دیتے ہیں۔ جو عموماً یہ ہوتا ہے کہ اس کی ضرورت ہو سکتی ہے یا اس طرح کے حالات پیش آسکتے ہیں کہ کسی کو غلام بنایا جا سکے۔ لیکن موجودہ تناظر میں معاصر نقطہ نظر میں اپنا جواب نہیں دیتے۔ جس سے ابہام باقی رہ جاتا ہے، تو یہ ابہام کیسے دور کیا جائے؟

ڈاکٹر عادل: اس موضوع کا انتخاب ہی اسی لیے کیا گیا تھا کہ اس بات کی وضاحت کی جائے کہ عالم اسلام بھی بین الاقوامی معاہدات کا حصہ ہے، اس لیے اگر فقہ کی رو سے غلامی کی یہ قسم برقرار ہے تو پھر بھی عالمی معاہدات کا حصہ ہونے کی وجہ سے اس پر عمل درآمد کیا جانا ممکن نہیں۔ یہ خواہش تو ہو سکتی ہے کہ جنگی قیدیوں کو غلام یا باندیاں بنالیا جائے اور اس حوالے سے کیے گئے معاہدات سے بھی دست بردار ہوا جا سکتا ہے، لیکن عالمی تناظر میں یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کا نقصان کس کو ہو گا۔ موجودہ صورت حال میں تو معاہدات کا فائدہ مسلمانوں کو ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر محمد طاہر منصوری: اسلام اور کفر کے درمیان بنیادی تعلق امن کا ہے، اور جنگ ایک ناگزیر استثنائی صورت حال ہے جس کے احکام کو عمومی حالات پر منطبق کرنا درست نہیں۔ غلامی کے

1. Rahima, Swara. *Islam Rejects Sexual Violence*. (Blog 2020)

حوالے سے اگر آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرامؓ کا طرز عمل دیکھیں تو یہ پتا چلتا ہے کہ اس کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے اور ہر ایسا قدم اٹھایا گیا ہے جو اس کے خاتمے پر منتج ہو۔ اس حوالے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول پیش کیا جاسکتا ہے کہ تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنانا شروع کر دیا جبکہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد جنا ہے۔ اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو اسلام میں اصل تصور انسانوں کی آزادی کا ہے نہ کہ غلامی کا۔